امر بیل

محبت کی امر بیل میں ہمیشہ ہائی سنتھ کے پھول لگتے ہیں۔

تم نے کبھی ہائی سنتھ کا پھول دیکھا ہے زری؟

ہائی سنتھ کا پھول جس کی پنکھڑیوں پر تاسف کے آنسو منجمد ہوں اور جس کی مخملیں جلد سے جدائی کی خوشبو آئے ـــــ لیکن تم نے تو ہائی سنتھ کا پھول دیکھے بغیر ہی اپنے دل کے نہاں خانے پر کیوپڈ دیوتا کو سلایا۔ اور پھر آپ ہی آپ ایک رات چپکے سے اس کا گلا گھونٹ دیا۔ محبت کا کھیل گنجفہ کا کھیل نہیں ہوتا زری ـــــ پھر تم نے اسے پھول کی بازی کیوں سمجھا۔ یہ تو ایک عبادت ہے، ایک معرفت ہے، ایک پہیلی ہے جس کی سمجھ برسوں نہیں آتی۔ تم تو ابھی فلیٹ بوٹ پہنتی تھیں۔ کندھے پر دو چوٹیوں میں سرخ ربن ڈالتی تھیں۔ تمہاری عمر آئس کریم کھانے اور نٹ بال کھیلنے کی تھی۔ پھر تم نے سانپ کی بانبی میں ہاتھ کیوں ڈالا۔ تم سے کس نے کہا تھا کہ پارے کا کشتہ اتنی آسانی سے بن جاتا ہے۔

تم نے محبت کیلئے جو ہدف چنا وہ بڑا پرپیچ تھا۔ کیسی عجیب سی بات ہے کہ میری محبت تم سے مہ رخ کے توسط سے ہوئی۔ اگر وہ خجستہ صورت لیکن منحوس لڑکی میری زندگی میں نہ آتی تو تمہاری محبت کا سرچشمہ میرے دل میں کبھی نہ پھوٹتا۔ تمہاری محبت میرے دل میں اس طرح بچھی ہے جیسے کسی پرانے مزار پر تازہ پھولوں کی چادر ـــــ نئی عقیدت کا اظہار۔ اس مرقد میں تمہاری محبت دفن ہے اور تعویذ پر ہائی سنتھ کی پھولوں کی تازہ چادر رہتی ہے ـــــ جن کے مومی وجود پر تاسف کے آنسو منجمد ہیں۔

ان کی مخملیں جلد سے جدائی کی خوشبو آتی ہے۔ موت کی ٹھنڈی باس اٹھتی ہے۔

آنڈا سے پہلی ملاقات نیل کے کنارے ہوئی تھی۔ میں اپنے دیس واپس آ رہا تھا اور وہ اپنے ہسپانیہ لوٹ رہی تھی۔ مسجدِ قرطبہ کے عقب میں رہنے والی آنڈا جس کے چھپٹے سینے پر پلاٹینم کی صلیب آویزاں تھی۔ ہماری ملاقات چند روزہ تھی۔ بادام کے شگوفوں کی طرح معطر بیحد نازک اور اپنی موت کے احساس سے لرزاں۔ اس شام ہم دونوں ہوٹل سے اٹھ کر نیل کے ناسپاس پانیوں میں فاتلے آ بیٹھے تھے۔ اندھیرا سست مدعی کی طرح دبے پاؤں آگے بڑھ رہا تھا اور قاہرہ شہر کی بتیاں نیل کے ناسپاس پانیوں میں فانوس رنگ جل بجھ رہی تھیں۔ ان منعکس بتیوں کو دیکھ کر ہسپانیہ کی دختر نے کہا تھا:

"آصف! ان بتیوں کا اپنا تو کوئی وجود نہیں ——— نہیں ہے ناں۔"

"کن بتیوں کا آنڈا؟"

"جو بتیاں آپ آپ نیل کے سینے سے آ لگی ہیں۔ میلوں کا فاصلہ طے کر کے۔"

"نہیں ———"

آنڈا لوناچیاری نخی جادوگرنی تھی۔ اس کا زمین ولیسار میسہ پانی دیوار کی طرح شکست سے ناآشنا تھا۔ اس میں کارمن کی روح تھی۔ وہ مسجدِ قرطبہ کی طرح خوبصورت اور جادو اثر رہی تھی لیکن نہ جانے اس روز ہمارے قیام کی آخری شام وہ شمع رو کیوں قطرہ قطرہ پگھل رہی تھی۔ اس کی ستواں ناک ضبط کیے ہوئے آنسوؤں کے باعث ٹیڑھی نظر آ رہی تھی اور سینے کی چھپنی میں رُکی ہوئی آہوں نے زیر و بم کا نامتواتر ساز چھیڑ رکھا تھا۔

"اس میں ان بتیوں کا بھی تو کوئی قصور نہیں جو قاہرہ میں جل رہی ہیں ——— ہے نا ———"

مرد ہر لمحہ جرات میں بزدل بن جاتا ہے۔ وہ کچھار میں پناہ لینے والے شیر ببر کی مانند سویا رہنا چاہتا ہے۔ مجھ پر بھی اس وقت بزدلی طاری تھی۔ کوئی چیز فضا میں ایسی تھی جو نامانوس تھی جو بموں کی خوشبو سے مشابہ لیکن عطرِ حنا میں لپٹی گیس غبارے کی طرح اوپر اٹھ رہی تھی۔ تمام پرانو نے

پن کی روشنیاں پڑ رہی تھیں ۔ مجھے .... لگ رہا تھا ... میں نہیں ہوں ـــــ ۔ اور پھر بھی کرسی پر بیٹھا ہوں ۔ میرا کوئی مستقبل نہیں ۔ میرا کوئی ماضی نہیں ـــــ میرا حال بھی سائے کی مانند ہے جس کا اپنا کوئی وجود نہیں ـــــ میں اس کیفیت سے ڈرتا تھا جیسے اپریشن ٹیبل سے بھاگ کر میں سڑکوں پہ بلا مقصد گھوم رہا ہوں اور میرے سر پہ میرے جسم میری شریانوں میں کلوروفارم کا نشہ سناں سناں کر رہا ہے ۔

"میری بات کا جواب دو آصف !"

اس کی بات کا ایک ہی جواب تھا کہ میں چپکے سے اٹھتا اور نیل کے پانیوں کو اپنا غیر مرئی حساس اور کلوروفارم سے مدہوش جسم سپرد کر دیتا ۔ لیکن میں نے اپنی بزدلی کو منطقی ڈھکوسلوں میں چھپاتے ہوئے کہا ـــــ "سیدھی بات کیا کرو ۔ سمجھ میں آنے والی ۔ ہر وقت کا رومن بننے کی کوشش نہ کیا کرو ۔"

اس نے منہ پھیر لیا ۔ نیلی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے وہ بولی :

"جو خواہ مخواہ کسی کا عکس اپنے دل میں ڈال لیں اور اسے چھپائے رکھیں ۔ .... وہ بیوقوف ہوتے ہیں ناں ۔"

"خدا کیلئے اتنی خوبصورت شام کو تباہ نہ کرو ۔"

لیکن آمنہ کے اپنے وجود کے اندر خصمی پرنالہ گر رہا تھا ۔ اس کے اندر شکست و ریخت کا ایک طوفان موجزن تھا ۔ وہ شام رنگ لمحوں کی کیا پروا کرتی ، بھڑک کر بولی : "اگر نیل ان بتیوں کو اپنے پانیوں میں یوں بسانا چاہتا ہے تو اس میں شہر کی بتیوں کا کیا قصور ۔"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے آمنہ !" ـــــ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ۔

وہ کسی ریڈیو پر ام کلثوم گا رہی تھی ۔ ہر تان میں فی سبیل اللہ ، فی سبیل اللہ کی التجا تھی ۔ میرے اردگرد رنگین چھتریاں ، ان کے نیچے بیٹھے ہوئے لوگ ، ان میں گھومنے پھرنے والے بیرے چرخے کی مال کی طرح گھومتے نظر آرہے تھے ۔ آمنہ اپنی نم آنکھوں میں چقماق سے آنسو لئے بولی : ہائی سنتو

پھول کی کہانی سنی ہے تم نے"۔

"نہیں ـــــ اور میں سننا بھی نہیں چاہتا۔ میری ایک کزن مجھے فلمی کہانیاں سنایا کرتی ہے میں کبھی ان کے گھر نہیں جاتا"۔

"ہائی سنتھ کی کہانی فلمی نہیں ہے آصف۔ یہ تو دکھ کے پھول کی داستان ہے ــــ ایسا پھول جس میں محبت کا مدفن تھا"۔

میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ میری قوتِ مدافعت جواب دے چکی تھی۔ سارے میں نسوانی ہواؤں کی سیٹیاں بج رہی تھیں۔ چرخے کی مال گھوم رہی تھی اور ام کلثوم التجا کر رہی تھی ــــ رو رہی تھی۔ فی سبیل اللہ ــــ فی سبیل اللہ۔

انڈرا اپنے آپ سے بولی ــــ "کہتے ہیں کہ دیوتا اپالو کی دوستی ایک یونانی نوجوان سے تھی۔ ہائی سنتھ نامی یہ یونانی نوجوان حسن میں بے مثل تھا۔ انگور کے پتوں کا تاج پہنے اخروٹ کی لکڑی کی کمان سنبھالے چیتے کی کھال میں ملبوس جب وہ پہاڑیوں سے اترتا تو یونان کی دوشیزائیں پانی بھرنا بھول جاتیں۔ خود اپالو ــــ سورج کی طرح پلک جھپکے بغیر اس کی طرف تکتا چلا جاتا ــــ لیکن اپالو اور ہائی سنتھ کی دوستی چند روزہ تھی۔ اپنی موت کے احساس سے خود لرزاں۔ یہ بتاؤ آصف ہر خوبصورت چیز، ہر ملاپ چند روزہ کیوں ہوتا ہے ــــ کیوں ہوتا ہے۔ بتاؤ ناں؟"

میں چپ رہا۔ میری عافیت اسی میں تھی کہ میرے منہ سے کچھ نہ نکلے۔

"سنو آصف۔ ابھی ہائی سنتھ اور اپالو پر محبت کی اولین سرشاری طاری تھی کہ ہائی سنتھ مر گیا۔ یہ بتاؤ جب محبت کا نشہ چڑھا ہو تب موت کا حادثہ ہو تو المیہ زیادہ ہے کہ محبت کا نشہ اتر جانے پر ــــ یعنی دونوں میں سے کون سا بڑا المیہ ہے"؟

نیل کے پانی گنبد گونج بن کر میری طرف بڑھے۔ میں جلدی سے اٹھا اور اس کی کرسی پر جھک کر بولا ــــ "یہ میری آخری شام ہے پردیس میں ــــ اسے یوں مضمحل نہ کرو ــــ

آؤ بازار چلیں "

وہ اپنی جگہ سے اٹھے بغیر بولی ـــــ "تبھی کہا کرتے ہو کہ مشرق کے لوگ دل کے معاملے بہتر سمجھتے ہیں "

میں اس کے طعنے کا تھوتھا تیر کھا کر بیٹھ گیا اور وہ بولتی چلی گئی : "ہائی سنتھ کی قبر پر اپالو کے اتنے آنسو گرے کہ ایک دن قبر سے ایک پودے نے سر نکالا۔ ہولے ہولے اس میں پتیاں نکل آئیں اور پھر ایک پھول کھلا۔ ارغوانی رنگ کا ـــــ ہائی سنتھ کا پھول ـــ جب اپنے دیس لوٹ جاؤ تو یاد رکھنا کہ آنڈا کو ہائی سنتھ کے پھولوں سے عشق تھا عشق ـــــ"

میں نیل کے پانیوں میں جھلملاتی بتیوں کا رقص دیکھنے لگا ـــــ ارغوانی بتیاں ـــــ آسمانی بتیاں ـــــ گڈمڈ پھولوں کی قطاریں ـــــ آنڈا نے ایک چھوٹی سی سسکی لی سینے کے پہلو کی ہڈیوں میں ایک چھوٹا سا زلزلہ آیا اور وہ میرے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر بولی ـــــ "جانتے ہو۔ ہائی سنتھ کی پنکھڑیوں پر کیا لکھا ہوتا ہے ـــــ جانتے ہو آصف "

"نہیں ـــــ"

اس کے ہاتھوں کا دباؤ شکنجے کی طرح بوجھل بھی تھا اور آسمان میں تیرنے والے پر کی مانند ہلکا بھی ـــــ

"ہائی سنتھ پچھتاوے کا پھول ہے۔ محبت کا مدفن ہے۔ اس سے جدائی کی خوشبو آتی ہے اس میں تمناؤں کا لہو جھلملاتا ہے۔ اس کی ہر پنکھڑی پر لکھا ہوتا ہے افسوس ـــ صد افسوس ـــ"

اس کی آنکھوں سے دو چھوٹے سے آنسو چھلکتے ہوئے مجھ پر آن گرے۔

"جب میں پاکستان آؤں گی تو مجھے تاج محل دکھاؤ گے ناں "

میں نے اس کے گریبان میں لٹکی ہوئی صلیب کو چھو کر کہا ـــــ "تاج محل ہندوستان میں ہے آنڈا ـــــ تمہیں اپنا ہمسفر بدلنا پڑے گا بارڈر پر ـــــ"

آنڈا نے اب تک ضرور اپنا ہمسفر تلاش کر لیا ہو گا زیسی ـــ یہ تم ہی تھیں کہ جس میں

سفرِ حیات کا حوصلہ نہ تھا۔ ورنہ راستہ چاہے جاں گسل ہی سہی لیکن اس راہ میں اور آبلہ پا بھی ملتے ہیں۔ آنڈا کا میری زندگی سے ایسا ہی تعلق تھا جیسے بچوں کی نصابی کتابوں میں رنگین تصویروں کا وجود۔ ان تصویروں کا تعلق اصل متن سے ضمنی ہوتا ہے۔ اسی طرح آنڈا میری زندگی میں آئی اور چلی گئی۔ ایک طرح سے تم رُخ بھی میری زندگی میں اصل متن نہیں ہے۔

جب بھی بارش آتی ہے زری اور بوندیں گرم مٹی سے لپٹ کر سوندھی خوشبوئیں پھیلا جاتی ہیں میں تم کو ہمیشہ یاد کرتا ہوں رتم اس خوشبو کی طرح تھیں۔ انوکھی، انجان ــــــ گرم اور سرد کے باہم اتصال کی خوبصورت دلیل ــــــ آج شام سے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ بجلی ان سیاہ بادلوں میں گھبرائی پھرتی ہے۔ پہلے آسمان پر ایک سفید چادر لہرائی۔ پھر مشرق کی جانب سے اودی نیلی سیاہ سارٹھیوں کے تھان اڑ اڑ کر آنے لگے اور بہت جلد ان پڑے کے تھانوں نے غنب اودی تنبو کی شکل اختیار کرلی۔ اس تنبو کی طنابیں ابھی ٹھیک طور پر کسی بھی نہ گئی تھیں کہ جابجا غف کپڑے میں شگاف آگئے۔ مینہ اس طرح برسا جیسے کوئی عورت میکہ یاد کرکے رو دے۔ بارش کو دیکھ کر تمہاری یاد کا گھٹا ٹوپ اندھیرا میرے چاروں طرف چھانے لگا۔ میں نے کھڑکی کھول دی۔ مٹی کے گرم وجود سے لپٹی ہوئی ٹھنڈی بوندوں کی خوشبو اٹھی ــــــ کچھ لوگ کم ظرف اور چھچھلے ہوتے ہیں۔ ان میں محبت کا شیرہ جب غٹ غٹ انڈیلیں گرا تاہے تو عموماً ان کا وجود گڈی کا غذ کی طرح پھٹ جاتا ہے۔ کچھ کیلئے محبت بھرنے اور اترنے کا موقع ہوتی ہے۔ وہ اُچکے بنے ہوا میں تلواریں مارتے ہیں۔ کچھ مغل زادے محبت کے نذرانے کو ٹھوکریں مار مار کر کچے گھڑے کی طرح بے وقعت کر دیتے ہیں۔

ایسے ہی فرعونوں میں میرا شمار بھی تھا لیکن مہ رخ سے ملنے کے بعد نہیں۔ اس وقت مجھے محبت اور محبت میں محرومی دونوں کا احساس پوری طرح ہو چکا تھا۔

جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تو تمہارے سینے پر دو لمبی لمبی چوٹیاں تھیں جن میں بل دیئے ہوئے سرخ ربن گڑھل کے پھولوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ تمہارے پیروں میں فلیٹ بوٹ،

کانوں میں گول سنہری رنگ اور کندھے پر سکول یونیفارم کا سرخ دوپٹہ تھا۔ تمہارے گال پکے ہوئے سیبوں کی طرح شنگرفی ہو رہے تھے۔ اس سرخی میں کسی آئرن ٹانک یا غازے کی آمیزش نہ تھی۔ اوپر والے لب پر پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے تھے۔ یہی پسینہ کسی عمر عورت کی بدصورتی کی وجہ ہو سکتا تھا لیکن تم پر یہ صحت اور تازگی کا اشتہار تھا۔ آنکھوں کے دونوں جانب دنبالہ دار سُرمہ تھا۔ بھاگتے تیر کی طرح پُر افشاں اور تیز رو۔

یہ عمر عشق و عاشقی کی عمر نہ تھی۔ یہ عمر سوڈا واٹر، لیمن ڈراپس اور آئس کریم کی عمر تھی۔ تم اگر چیونگم منہ میں چبا چبا کر ٹی کو لیے کر چُست قمیض میں لچکاتی بانہیں لہرا کر میرے پاس سے گزر جاتیں تو مجھے تعجب نہ ہوتا۔ لیکن تم آکر چپ چاپ کھڑی ہو گئیں۔ تم نے نہ اپنی عمر پر ترس کھایا نہ اس مشکل راہ پر نظر کی جو تم نے اپنے لیے لمحوں میں انتخاب کر لی تھی۔ بس تم پر تو خبط اچھلا —— اور تم میری محبت میں گرفتار ہو گئیں۔ تمہاری طرف سے یہ پہلی نظر کی محبت تھی اس میں استانی جی سے والہانہ عشق کا دیوانہ پن بھی تھا۔ باپ سے دلی شیفتگی بھی تھی اور ایک اور چیز بھی تھی جسے صرف تم ہی سمجھتی تھیں۔ جو صرف تمہاری ہی رگِ جاں تھی۔

"میجر صاحب گھر پر ہیں بے بی؟"

بے بی کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"ڈیڈی نہیں ہیں جی۔ ممی ہیں اندر"

"تو انہیں جا کر بتایئے کہ آصف تو بر آیا ہے —— آصف تو بر یاد رہے گا ناں۔"

"جی آصف توبر صاحب —— یاد رہے گا جی ——"

پھر تم جالی کا دروازہ کھول کر اندر بھاگ گئیں۔ گیلری میں تمہارے بھاگنے کی آواز آتی رہی کہ مجھے اس عمر میں بھاگنا کتنا فطری اور خوبصورت فعل ہے۔ ہرن کی قلانچوں سے مشابہ عربی گھوڑے کی جست کی طرح بے خوف چیتے کی طرح سڈول جسم کو فضا میں تولتے ہوئے بھاگنا۔ یہ نیمی بھاگنا نہ تھا۔ ٹپے کھاتی گیند کا سا دوڑنا تھا۔ چند ہی لمحوں میں تم واپس بھی آگئیں۔

"جی۔ اندر آجایئے۔ ممی بلا رہی ہیں۔"

تم مجھے اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے گئیں۔ یہ بیٹھک یا دیوان خانہ کم تھا اور میجر اقبال کے شکار کئے ہوئے شیر چیتے، بارہ سنگھوں کا عجائب گھر زیادہ تھا۔ صوفوں پر ہرنوں کی ملائم گندم گوں کھالیں پڑی تھیں۔ آتش دان کے پاس دو چیتے مع اپنے چار بڑے بڑے خونخوار دانتوں اور نارنجی آنکھوں کے سر اٹھائے لیٹے تھے۔ کارنس پر بارہ سنگھے ٹنگے تھے۔ ان کے سینگ اخروٹ کی لکڑی کے بنے نظر آتے تھے۔ جا بجا ہاتھی دانت اور پیتل کا آرائشی سامان سجا تھا۔ سارے کمرے میں کھائے ہوئے چمڑے کی مہک تھی۔ تم مجھے کمرے میں بٹھاتے ہی پھر بھاگ گئیں۔ غالباً میں تمہارے رسی پھاندنے کے شغل میں مخل ہوا تھا۔

تمہاری ممی چند لمحے بعد تشریف لائیں۔

وہ پہلے سے بہت زیادہ موٹی اور سانولی ہو چکی تھیں۔ ساتھ ہی انہوں نے نہایت دہشت انگیز قسم کی گلابی لپ اسٹک بمقدار وافر استعمال کر رکھی تھی۔ بغیر آستینوں کے بلاؤز اور بڑے بڑے پھولوں والی واش اینڈ ویئر قسم کی ساڑھی میں وہ مجھے اپنے ماضی کا بھوت نظر آئیں۔

"ہیلو آصف ——— بیٹھو بیٹھو ——— ہم تو سوچ رہے تھے کہ تمہیں ڈھونڈھ نکالیں گے ایک دن، لیکن اقبال کو تو سوائے شکار کے اور کچھ سوجھتا ہی نہیں ——— زری ——— زری ڈارلنگ ———"

"مجھے ابھی مال پر رانا حمید مل گیا۔ اس سے پتہ چلا کہ اقبال کی تبدیلی لاہور ہو گئی ہے۔ بڑی مشکل سے گھر تلاش کیا۔ اس نے تو گلوب سینما کی طرف کوٹھی بتائی تھی۔ آپ لوگ تو صدر بازار کی طرف رہتے ہیں۔"

"رانا حمید وہیں آئے تھے لیکن وہ کوٹھی مجھے پسند نہیں آئی تھی۔ پانی کا پرابلم تھا۔ غسلخانوں میں سے کاکروچ نکلتے تھے۔ رات کے وقت بڑی ——— سیلن رہا کرتی تھی۔ سارے قالین خراب ہو گئے وہاں ——— آپ ابھی تک سیف گارڈ انشورنس میں ہی ہیں نا؟ ——— زری ——

زری ڈارلنگ۔ یہاں آؤ، انکل آئے ہیں۔"

"جی ہاں۔ ابھی تک تو ان ہی لوگوں کے ساتھ دانہ پانی بندھا ہے۔"

"شادی ـــــ ہو گئی کہ ابھی تک؟"

"ابھی تک نہیں۔"

تمہاری ممی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئیں اور تمہیں آواز دینے لگیں۔ تمہاری ممی ایک زمانے میں بڑی خوبصورت عورتوں میں شمار ہوتی تھیں۔ نمک کی کان تھیں، نقشہ اور جسم ایسا تھا کہ سارے میں ان کا چرچا ہوتا تھا۔ اب وہ ایک بے جان تودے کی طرح سامنے کھڑی کسی اینگلو انڈین بڑھیا کی طرح تمہیں بلا رہی تھیں۔

تم آ کر پردوں کے پاس رک گئیں۔

"آجاؤ زری ڈارلنگ ـــــ انکل آصف ہیں تم ان سے اپنی BOOTIES پہنا کرتی تھیں۔ پنڈی کے دن بھی خوب تھے۔ ہے نا آصف" ممی بولیں۔

"جی ہاں۔ ویسی بے تکلفی کا دور پھر میں نے کبھی نہیں دیکھا ـــــ یورپ میں بھی نہیں۔"

"کیسا انجوائے کرتے تھے ہم سب ـــــ یاد ہے آصف؟ وہ مری کی پکنک یاد ہے تمہیں جس روز زری تقریباً ڈوب چلی تھی۔"

"میری بے وقوفی تھی۔ میں نے تجربے کے طور پر پانی میں اتار دیا تھا۔"

ممی کھی کھی کر کے ہنسنے لگیں۔

"زری ڈارلنگ۔ انکل کو کافی تو پلاؤ۔ یہ کیا بچوں کی طرح پردہ پکڑ کر کھڑی ہو۔ جاؤ بیٹے!"

تم پھر بھاگ گئیں اور تمہاری ممی مجھے پرانے دنوں کے واقعات یاد دلانے لگیں۔ ایسے واقعات جو بظاہر ہم دونوں کے لئے بالکل غیر اہم تھے۔

یہ میری تمہاری پہلی ملاقات تھی۔ اسی ملاقات میں کیوپڈ دیوتا نے تمہیں منتخب کر کے تمہاری زنار بندی کر دی۔ تمہارے لئے یہ ملاقات حرزِ جاں تھی۔ اس ملاقات کو تم نے ہیرے جڑی انگوٹھی

کی طرح بار بار پرکھا۔ ہر سمت سے دیکھا قریب سے دور سے۔ اس کی چمک میں تمہیں دھنک کے سارے رنگ نظر آنے لگے۔ تمہارے لڑکپن کی فصیل میں یہ پہلی دراڑ تھی۔ اس ملاقات کے بعد جب بھی میں تمہاری طرف گیا تمہاری خوشی دیکھ کر مجھے ایکدن بھی شبہات نے نہ گھیرا کیونکہ میں تو تمہیں اپنے ہاتھوں جوتے پہنا چکا تھا۔ تمہیں سائیکل کی سیر کرانا اور تمہاری چوٹیوں میں ربن ڈالنا بقول تمہاری ممی کے ایک زمانے میں میرا محبوب مشغلہ رہا تھا۔ میں تمہاری خوشی کی اصل وجہ کبھی بھی جان نہ پاتا۔ اگر اچانک ایکدن تم سے ڈرامائی ملاقات نہ ہو جاتی۔

اقبال گھر پر نہیں تھا۔ تمہاری ممی اپنی کسی دوست کے ساتھ شاپنگ کو گئی ہوئی تھیں تم اپنی گیتوں کی کاپی لئے اکیلی آتشدان کے پاس بیٹھی تھیں۔

"ڈیڈی کہاں ہیں بے بی!"

"مرغابیوں کے شکار پر گئے ہیں جی ـــــ" تم نے جھٹ کاپی کو پشت کی جانب چھپا لیا۔

"اور ممی کہاں ہیں بے بی!"

"آپ مجھے بے بی نہ کہا کریں۔"

"کیوں؟"

تم نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا ـــــ "کیونکہ جی ـــــ کیونکہ ـــــ بس جی ـــــ آپ مجھے بے بی نہ کہا کریں۔"

حکمت عملی کے خلاف جو حرکت مجھ سے اسوقت ہوئی وہ ناقابلِ معافی ہے۔ میں نے تمہیں بچہ سمجھ کر تمہارا بازو پکڑا اور صوفے پر اپنے پاس بٹھا لیا۔

"پتہ ہے تم بہت تنگ کیا کرتی تھیں پنڈی میں۔ کیا بات ہے زری! تم کانپ کیوں رہی ہو؟"

میرا بازو تمہارے کندھوں کے گرد حمائل تھا اور تم ڈری ہوئی کبوتری کی طرح لرز رہی تھیں۔

"کیا بات ہے زری! بخار تو نہیں تمہیں ـــــ" میں نے انگریزی میں سوال کیا۔

تم خاموش رہیں۔

"تم ٹھیک تو ہو زری؟"

تم نے اٹھنے کی کوشش کی تو تمہارے ہاتھ سے گیتوں کی کاپی پھسل کر قالین پر جا گری۔ دا نت نکلے پچھے سے ایک نت ادھر۔ میں نے اسے ہرگز کھولنے اور پڑھنے کی نیت سے نہ اٹھایا تھا۔ لیکن کاپی کچھ اس انداز سے گری کہ پہلے صفحے پر بنا ہوا پان کے پتے جیسا دل جگر جگر چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں نے جھک کر اس دل کو اٹھا لیا۔ دل کے وسط میں ایک لمبا سا تیر کھنچا تھا جس سے آنسوؤں کی لڑی ٹوٹ کر صفحے پر بکھری پڑی تھی۔ اوپر انگریزی میں رقم تھا —— "الف کے لئے تو نہیں جانتا" —— اس تصویر کے گرد ارغوانی آسمانی پھولوں کی جدول بنی تھی —— ہائی سکول کے پھولوں کا حاشیہ۔

تم خوفزدہ کھڑی تھیں اور میں احمق پن سے بار بار پوچھ رہا تھا: "یہ الف سے کس کا نام شروع ہوتا ہے زری ڈارلنگ۔"

تم نے منہ پھیر لیا اور آہستہ سے بولیں۔ "اسے نہ دیکھئے پلیز —— پلیز۔"

میں نے صفحوں کو بڑی بے دردی سے الٹنا شروع کر دیا۔ "بے وقوف۔ انکل سے شرمایا نہیں کرتے۔ انکل تو راز دار ہوتے ہیں الٹا —— ہم کسی کو بتائیں گے تھوڑا ہی"۔

تمہاری کھلی آنکھوں میں آنسوؤں کا تزمرا پھیلنے لگا۔ میں نے اس کو اپنی بے وقوفی سے نہ سمجھا اور کاپی کو بے توجہی سے دیکھنے لگا۔ یہ تو ایک کھلی بن تھا جس میں شرم و حیا والے ہاتھی رہتے تھے جو بے سبب محبت کرتے تھے اور اس محبت کو سب سے چھپائے رکھتے تھے۔ سارے گیت انگریزی میں تھے۔ ہر گیت کے اوپر ایک ہی جملہ لکھا تھا:

"الف سے مخاطب ہو کر۔"

"پلیز۔ میری سونگ بک واپس کر دیجئے۔ پلیز۔"

اگر مجھے پل بھر کیلئے بھی احساس ہوتا کہ میرا نام الف سے شروع ہوتا ہے تو شاید میں بہت

جلد تمہاری کتاب لوٹا کر گھر چل دیتا لیکن میں تو پورے دو سیٹ ٹینس کے کھیل کر آ رہا تھا۔ میرا سارا وجود ٹپہ کھائی گیند کی طرح کھنڈرا ہو رہا تھا۔

پلیز ــــ

یکدم میری نگاہ ایک صفحے پہ رک گئی۔ اوپر بار بار لکھا تھا۔ شاید کبھی ــــ شاید کبھی ـ نیچے کو نوٹ مار کے مخصوص لکھائی میں نظم مرقوم تھی۔

"الف ــــ شاید کبھی تمہیں میرا خیال آئے

تنہائی میں

شاید جس کا آج تمہیں انتظار ہے وہ بے وفا نکلے

شاید!

تم آہیں بھرو اور دست بدعا ہو

میرے لئے ــــ شاید

کون جانے میں لوٹ کر آ بھی سکوں۔"

نظم نے مجھ سے پسلی مار کر ساری ہوا نکال دی۔

"یہ الف کون ہے زری ــــ کون ہے یہ؟"

لیکن تمہارے چہرے پہ موٹے موٹے آنسو برس رہے تھے۔ فلمی آنسو نہیں بلکہ وہ آنسو جو بڑی شدت سے حلق میں بھی اترا کرتے ہیں۔

"آئی ایم سوری بے بی ڈارلنگ خدا قسم ــــ لو اپنی سونگ بک۔ یہ لو۔ میں تمہارا راز نہیں جاننا چاہتا ــــ پلیز بے بی!"

میں نے تمہیں چپ کرانے کی نیت سے تمہارا سر اپنے سینے سے لگایا۔ اگر چانکیہ زندہ ہوتا تو وہ دست بستہ عرض کرتا کہ مہاراج! ایسی کنیا کو سینے سے لگانا حکمت عملی کے خلاف ہے۔ یہ سراندیپ کی سروپ نکھا ہے۔ کام دیو کی بانی پہ ننگے پیر آنے والی۔ ایسی کنیا کی ناک اوّل تو ہوتی

ہی نہیں اور جو باقی رہ بھی جائے تو اسے کاٹ لینا ہی بہتر ہے۔ حکمتِ عملی کی دوسری غلطی کر چکنے کے بعد ــــ بہت بعد میں مجھے احساس ہوا کہ اگر مجھے الف کا نام نہ معلوم ہوتا تو اس میں ہم دونوں کی بہتری ہوتی۔

اس واقعے کے بعد کئی روز تک میں تمہارے گھر نہ گیا۔ دل میں ایک انجانا سا خوف تھا گو بظاہر اس خوف کی کوئی وجہ نہ تھی۔ تم نے اپنے منہ سے کچھ نہ کہا تھا لیکن میرے دل کی ٹیلی پرنٹر پر مسلسل یہی خبر پہنچ رہی تھی کہ حذر کرو..... بچ جاؤ۔ آگے خطرہ ہے۔ زیرو لائن ہے یہ جگہ بیمہ کمپنی کے ایجنٹ کیلئے بارود خانے سے کم نہیں۔ تمہارا VACCINATION کارڈ مکمل نہیں حذر کرو..... بچ جاؤ۔

جب سے یہ پرچہ دل کو لگا تھا میں نے چھاؤنی کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اچانک ایک دن مجھے دفتر میں اقبال کا فون آ گیا۔

"ابھی اسی وقت گھر پہنچو۔ میں چولستان سے تین چیتل اور دو ہرن تو مار لایا ہوں۔"

میں نے کام کا عذر پیش کرنا چاہا تو اس نے دھمکی دی ــــ "سنو۔ اگر آدھ گھنٹے میں نہ پہنچے تو ہم خود تمہیں لینے آ جائیں گے ــــ خدا حافظ۔"

پیشتر اس کے کہ میں کوئی معقول بہانہ تراش سکتا فون ادھر سے بند ہو گیا۔ میں عجب گھن چکر میں پڑ گیا۔ نہ تو جانے پر طبیعت آمادہ ہوتی تھی نہ ٹھہرنے کی جا تھی۔ ہموار زندگی میں یہ نیا شاخسانہ پیدا ہو گیا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد جب میں بالآخر وہاں پہنچا تو ممی اور ڈیڈی برآمدے میں بیٹھے تھے۔ حسبِ عادت اقبال پائپ پی رہا تھا۔ چہرے پر بڑی بشاش مسکراہٹ تھی۔ ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ دھرے اوپر والی ٹانگ بڑے تواتر سے ہلائے جا رہا تھا۔ ممی کی کرسی سے چند قدم پرے ہرن اور چیتل پڑے تھے اور ان کے پیٹ کوئلوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ممی ایک چھوٹا سا رومال لئے اپنا ناک کریدنے میں مشغول تھیں۔

"ہیلو ینگ مین ــــ کمال ہے ادھر کا چکر ہی نہیں لگاتے۔ تم اچھے دوست ہو ــــ"

اقبال نے اپنی کرسی سے اچھل کر کہا۔

تمہاری ممی نے پہلے تمہیں آواز دی اور پھر رومال سے کہنی صاف کرتے ہوئے بولیں۔ " ہم تو تمہارے ہوٹل آ رہے تھے ہرن لے کر۔ پھر اقبال کہنے لگا یہ ہرن اس کے کس کام کا۔ وہ تو ہوٹل میں رہتا ہے۔"

تم باہر آئیں تو میں نے محسوس کیا کہ تمہارا چہرہ ہسپانوی لیموں کی طرح زرد ہو چکا تھا۔ سرخ ربن فلیٹ بوٹ اور یونیفارم کے باوجود تمہاری آنکھیں باب المندب بن چکی تھیں۔ تم میں ایک ایسی بیاہی ہوئی عورت کا سروپ تھا جس کا شوہر اسے پہلی رات ہی چھوڑ گیا ہو۔

"زری نہایت اعلیٰ کباب بناتی ہے آصف ۔۔۔۔ انکل کو سلام کرو زری ڈارلنگ۔"

تم مقدس کبوتر جیسا سفید ہاتھ اٹھا کر پیشانی کی طرف لے گئیں۔

"یہ تو آپکو بہت یاد کرتی ہے آصف۔ ابھی کل ہی کہہ رہی تھی اب تو انکل کبھی آتے ہی نہیں میں نے جواب دیا تمہارے ڈیڈی چولستان گئے ہیں۔ وہ بھلا کس سے ملنے آئیں۔"

میں نے تمہاری جانب دیکھا۔ تمہارے ہونٹوں میں ضبط کئے ہوئے آنسوؤں کی کپکپاہٹ تھی۔ آنکھوں میں بے رخی اور اپنی کم نصیبی کا گلہ تھا۔ ان آنکھوں میں ایک پوری داستان تھی۔ شہر پومپیائی کی تباہی کی داستان۔ میں نے اس کی عبرانی زبان بظاہر سمجھتے ہوئے کہا: "زری تو ہم سے بولتی ہی نہیں۔ ہم کس سے ملنے آئیں بھلا۔"

اپنے غلط جواب پر پشیمان ہو کر میں نے فوراً ہی باتوں کا رخ پلٹ دیا ۔۔۔۔ "اچھا یہ بتاؤ کہاں کہاں شکار کرنے گئے۔"

"پہلے تو گئے بہاولپور ۔۔۔۔ وہاں نواب صاحب کے مقربین میں سے ایک حضرت سانڈ تھے۔ بڑا آسائشی شکار کھیلا بالکل پرنس آف ویلز بن کر۔ شکار کم اور ضیافتیں زیادہ ہوئیں۔ پھر چار دن چولستان میں رہے ۔۔۔۔ ونڈر فل ۔۔۔۔ سمندر ۔۔۔۔ پہاڑ ۔۔۔۔ اور ریگستان یہ تینوں اللہ نے اس لئے بنائے ہیں کہ جب انسان زیادہ اترانے لگے تو انہیں دیکھ کر اپنے

اصلیت کو پہچانے"۔

"کافی پئیں گے آپ ——" ممی نے سوال کیا۔

اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر زری کو آرڈر لگایا۔ "جاؤ زری۔ انکل کیلئے کافی لاؤ۔ چپس اور ویفرز بھی لانا۔"

اقبال اپنی ترنگ میں بولتا گیا۔ "یار چولستان خوبصورت ہے۔ بہت ہی خوبصورت خاص کر چاندنی میں۔ لیکن وہ سندربن والی بات کہاں۔"

تمہاری ممی نے گہرے فیروزی رنگ کا پلو کندھے پہ گھسیٹ کر کہا: "توبہ توبہ۔ میمن سنگھ میں یہ اسی قدر خوش تھے آصف کہ کیا بتاؤں۔ صبح صبح آدھی درجن کیلے کھاتے۔ رات کو دو چار انناس۔ اور شام کے وقت کچے ڈاب۔ ان کا بس چلتا تو کبھی لوٹ کر مغربی پاکستان نہ آتے۔"

"میری زندگی کے چار بہترین سال میمن سنگھ میں گزرے ہیں۔ وہ شکار ہے وہاں یار۔ وہ شکار ہے کہ انسان شکار AFFORD ہی نہیں کرسکتا۔ کارتوس ختم ہو جاتے ہیں لیکن شکار ختم نہیں ہوتا۔ میلوں پھیلا سبزہ۔ جھیلیں بھرے —— کوئی بیوٹی ہے۔ کوئی وائلڈ لائف ہے مائی گاڈ —— ونڈرفل —— ونڈرفل —— لیکن یہ تمہاری بھابی بہت بور ہوئیں وہاں۔"

تمہاری سانولی ممی نے فوراً کہا —— "توبہ۔ میرا تو رنگ سنولا گیا تھا وہاں۔ سال دو اور ہوتی تو بالکل کالی ہو جاتی۔"

"میں تو ریٹائر ہو کر وہیں چلا جاؤں گا۔ یا کھلنا میں کاٹیج بنالوں گا یا چندر گونا میں جھونپڑی ڈال لوں گا —— میمن سنگھ اب SOHPISTICATED ہو چلا ہے۔"

"چاٹگام بہتر ہے" —— ممی بولیں —— "ہم لوگ بھی چھٹیوں میں آجایا کریں گے۔"

"کہیں بھی ہو۔ رہوں گا مشرقی پاکستان میں۔ یار آصف۔ اس قدر سادہ زندگی ہے ان لوگوں کی۔ ایسی سادہ زندگی کہ انسان عبرت پکڑتا ہے۔ ہر گھر کے آگے ایک پول بھی ہوتا ہے چھوٹا سا۔ سارا خاندان اس میں تین چار بار نہاتا ہے۔ باتھ روم کا خرچ صفر۔ بارہ روپے کی فرسٹ کلاس

دھوپ آتی ہے ـــــ ایک بیون لی ایک دھولی۔ بیر دل میں کھڑا ویں۔ سونے کو سیتل پائی۔ کھانے کو مچھلی بھات۔ نہ انھیں کوئی کراکری چاہیئے نہ قالین درکار ہیں نہ الیکٹرک گڈز۔ سبحان اللہ کیا زندگی ہے۔ شیر کی طرح آزاد پھرتے ہیں بنوں میں۔

"توبہ بس بھی کیجیئے۔ بہشت کا نمونہ ہی بنا دیا مشرقی پاکستان کو۔"

"بس کیسے کروں۔ جس نے ایک بار ڈابھ پی لی اس نے سوم رس پی لیا۔ یار آصف۔ کیا لذت ہے کچے ناریل میں۔ سبحان اللہ۔ ونڈرفل۔ کبھی گئے ہو مشرقی پاکستان؟"

"جاتا ہی رہتا ہوں۔"

"پھر کیسی جگہ ہے۔"

"تفریح کے لیے نہایت اعلیٰ ہے۔"

"بالکل ٹھیک۔ بالکل ٹھیک ـــــ" ممی چہکیں۔

"تم لوگ جنت میں بھی صرف تفریح کیلئے جاؤ گے۔" اقبال نے کہا۔

اتنے میں تم کافی لے کر آگئیں اخروٹ کی لکڑی کے بڑے ٹرے میں۔ تم میرے پاس بیٹھ کر کافی بنانے لگیں۔ جب بھی تم میری طرف نگاہ کرتیں تو مجھ نکلنے کے سب بل کھل جاتے۔ مجھے سلسلۂ کلام جوڑنا مشکل ہو جاتا۔ کوئی چیز مجھے اندر ہی اندر کچا رہی تھی کہ مجھے جلد گھر جانا چاہیئے لیکن اقبال ہر قسم کے کارتوس، بندوقوں کی قسمیں، مچان باندھنے کے طریقے جانوروں کی شکار سے بچنے کی گاتیں آدھی رات، پچھلے پہر اور دوپہر کے شکار کے فوائد اور نقصانات پر سیر حاصل بحث کرتا رہا۔ یک طرفہ بحث جس میں میری شمولیت برائے نام اور تمہاری ممی برائے صحبت شامل رہیں۔ تم کونے میں کتاب لیے بیٹھی رہیں۔ گو کئی بار تمہاری ممی نے تمہیں سو جانے کو کہا لیکن تم نے سنی ان سنی کر دی۔

عجیب بات ہے مجھے تمہارے دلی جذبات کا اندازہ ہو چکا تھا۔ پھر بھی میں اپنے آپ کو سمجھا رہا تھا کہ یہ میری خود رسائی ہے۔ کبھی اس قدر پیاری بچی کو عشق ہو سکتا ہے۔ یہ سب کنجوں کی جھوٹی کھیل ہے کہ بازی ہار جانے پر سب کھلاڑی اپنے اپنے کپڑے واپس لے کر ہنسی خوشی اپنے اپنے گھروں کو

لوٹ جائیں گے —— مجھا نکل تمہا انسان سے ایسی محبت —— اور پھر وہ بھی اتنی کم عمر معصوم لڑکی کے۔ توبہ توبہ!

اس روز کے بعد میں نے دل ہی دل میں عہد کر لیا کہ جو کچھ بھی ہو گا میں تمہارے گھر نہیں جاؤں گا۔ لیکن ایک انشورنس کے سلسلے میں مجھے ایک ایسے گھر جانا پڑا جہاں میرے عزم کو توڑنے والی تمہاری ممی موجود تھیں۔ انہوں نے میرے عذر کو پس پشت ڈال دیا اور مجھے اپنے ساتھ لے گئیں۔ آخری بات جو انہوں نے کی اس کے بعد انکار کی گنجائش نہ تھی وہ بولیں: میرے پاس گاڑی نہیں ہے صرف مجھے گھر پہنچا آؤ۔ اترنا نہ اترنا تمہاری مرضی ——

اور جس وقت میں نے کار پورچ میں کھڑی کی وہ فوراً سے اتریں اور اقبال کو فون کرنے چلی گئیں۔ میرا ارادہ اندر جانے کا نہیں تھا۔ میں صرف تمہاری ممی کو تکلفاً خدا حافظ کہنے کیلئے رک گیا۔ لان کے ایک گوشے میں رنگین نواڑ سے بنی ہوئی کرسیاں پڑی تھیں۔ میز پر تمہاری کتابیں بکھری تھیں۔ ظاہر ہوتا تھا جیسے تم ابھی پڑھتی اٹھ کر گئی ہو۔ میں وقت گزاری کے طور پر ان کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ تمہاری انگریزی کی لکھائی اچھی تھی لیکن اردو کے حروف ناپختہ اور بیگانہ تھے۔ رف کاپی میں ایک مضمون بہار پر ایک ۔۔۔ کی ۔۔ اور چھوٹے چھوٹے پیروں کو اختصار سے لکھنے کی مشق کی گئی تھی۔ جا بجا میرا نام لکھ کر اسی طرح پنسل سے کاٹا گیا تھا کہ بمشکل پڑھا جاتا۔ میرا دل خوف سے لرزنے لگا۔ آسمان پر جیسے طیارے زناٹے سے گزرتے ہوں تو گھر کی مزدور کھڑکیاں دروازے اسی طرح لرزا کرتے ہیں۔ اسی کاپی کے آخری صفحے کو پنسل سے کاٹ کاٹ کر سیاہ کیا ہوا تھا۔ میرے دل نے گواہی دی لیکن تجسس نے حرف کو شناخت کیے بغیر نہ چھوڑا۔ صفحے کے ایک کونے میں حروف ابھی اچھی طرح مٹائے نہ گئے تھے۔ اوپر میرا نام لکھا ہوا تھا۔ نیچے تمہارے نام کے انگریزی میں ہجے کیے گئے تھے۔ جو حروف دونوں ناموں میں موجود تھے انہیں بعد از آں کاٹ کر محبت اور نفرت کا پتہ لگایا گیا تھا۔ اس عمل سے ظاہر ہوتا تھا کہ تمہیں مجھ سے محبت اور مجھے تم سے نفرت ہے۔ تم نے یہ نتیجہ بدلنے کے لیئے سارا صفحہ سیاہ کر دیا تھا —— میں تمہیں کیا سمجھاتا زری کہ جب نصیب کا

ہارا ڈوب جاتا ہے تو کوئی عمل کام نہیں آتا ـــــ میں تمہیں کیا بتاتا کہ محبت، تو امربیل ہے ـــ جس درخت پر یہ چڑھ جاتی ہے وہ پیڑ سوکھ جاتا ہے اور درخت ایک دن آپ ہی آپ گر جاتا ہے، ـــــ میں تمہیں کیا سمجھاتا کہ محبت کی امربیل میں کبھی کسی قسم کے پھول نہیں لگتے۔ اس بیل میں تو ہمیشہ ہائی سنتھ کے تنگ غنچے کھلتے ہیں ـــ پشیمانی کے ارغوانی پھول ـــ تاسف کے آسمانی پھول!

میں تم سے ملے بغیر تمہاری ممی کو فون کرتا چھوڑ کر فوراً ہی چلا گیا۔ کئی گھنٹے ہوٹل کے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں کروٹیں بدلنے کے باوجود مجھے ٹھنڈے پسینے آتے رہے۔ کیسے بوسیدہ حروف ـــــ ایل او وی ای سے بھری ہوئی کاپی۔ ذرا سی برآمدے میں آہٹ ہوتی تو میں چوکنے جانور کی طرح اٹھ بیٹھتا اور آہٹ پر کان دھر کر سوچتا کہیں یہ زری نہ ہو ـــــ کہیں اس کے دماغ کی ڈھبریاں اس قدر ڈھیلی نہ پڑ گئی ہوں کہ وہ یہاں تک آ گئی ہو۔ پھر جی کو تسلی دیتا کہ اول تو وہ میرے ہوٹل کا رستہ نہیں جانتی ہو گی اور پھر اتنی چھوٹی عمر میں اتنی جرأت کہاں سے آ جائے گی۔ مجھے بھی ہالی وڈ کا کوئی ایڈیٹ سمجھ کر محبت کرنے بیٹھ گئی ہے۔ چند روز ملیریا بخار جیسی تھرتھری چھوٹے گی۔ پھر آپ ہی آپ پنڈا نارمل ہو جائے گا۔

اب میں نے پکا عہد کر لیا تھا کہ تمہارے گھر کسی قیمت پر بھی نہ جاؤں گا۔ اور تو اور میں یہاں تک سوچنے لگا تھا کہ اپنی تبدیلی کمیشن کے کراچی کروالوں تاکہ اس دھندلے جنون سے چھٹکارا ـــ!

اس شام میں نہا کر غسل خانے سے نکلا تو مجھے برآمدے میں چوڑیوں کے چھنکنے کی آواز آئی۔ پھر یوں لگا کسی نے میرے کمرے کا کنڈا کھولنے کی کوشش کی ہو۔ میں نے کنپٹیاں اٹھا کر پوچھا:

"کون ہے؟"

ابھی میں قمیص پہن ہی رہا تھا کہ تم دروازہ کھول کر اندر آ گئیں۔ میں کلر زدہ زمین کی طرح سفید پڑ گیا۔ سینے پر وہی دو چوٹیاں اور چوٹیوں کے سروں پر سرخ گل دعل کے پھول، لٹھے کی سفید

سفید شلوار قمیض اور کندھوں پر سفید دوپٹہ ــــ اِک ایک بات خلافِ معمول تھی۔ تمہارے دونوں ہاتھوں میں آج کالی چوڑیاں نظر آرہی تھیں۔

"زری ــــ ہیلو بے بی! تم یہاں کیسے؟"

لمحہ بھر کو مجھے وہم ہوا کہ شاید تمہارے والدین نیچے کھڑے ہوں اور انہوں نے محض مجھے چڑانے کی خاطر پہلے تمہیں بھیج دیا ہو۔ میں اس وہم پر بھروسہ کر کے جلدی سے برآمدے تک گیا اور نیچے جھانکنے لگا۔ ایک بھڑکی زرد اور سیاہ ٹیکسی پھاٹک سے نکل رہی تھی۔ لان ــــ پورچ اور نیچے سڑک تک تمہارے والدین جیسا کوئی بھی شخص موجود نہ تھا۔ میں ڈرتے ڈرتے واپس آیا اور پہلی بار میں نے تمہارے چہرے کی طرف دیکھنے کی جرأت کی۔ تمہاری آنکھیں زیادہ رو لینے کے باعث سرخ ہو رہی تھیں۔ ہونٹ اور ناک کی پھننگ یاقوت رنگ کی تھی اور تم چھوٹے سے رومال کی لگدی بنا رہی تھیں۔

"کیا بات ہے زری! ممی ڈیڈی کہاں ہیں؟"

تم چپ چاپ کھڑی رومال کا کونا چبانے میں معروف رہیں۔

"بات کیا ہے۔ کچھ بولو ناں ــــ" میں نے انگریزی میں سوال کیا۔

"میں اکیلی آئی ہوں جی ــــ"

زن سے سارا ہوٹل میرے پیروں تلے سے نکل گیا۔

"کیوں ــــ کیوں بیٹے؟"

میں لفظ بیٹے کا قفل ڈال کر تمہارے جذباتی وجود کو مقید کرنا چاہتا تھا لیکن اس کا اثر الٹا ہوا۔ آنسوؤں کی چمک پھر سے آنکھوں میں پیدا ہو گئی اور تم نے تھوک نگلتے ہوئے کہا ــــ "آپ مجھ سے ناراض ہیں جی!"

"نہیں نہیں نہیں ــــ ہرگز نہیں ــــ توبہ۔ ہرگز نہیں ــــ یہ خیال تمہیں کیسے آیا: کبھی انکل ناراض ہوتے ہیں؟"

بحر دل میں ایک سے وزن کے آنسو تمہارے گالوں پر بہنے لگے۔

"پھر جی آپ ہمارے گھر کیوں نہیں آتے؟"

"آؤں گا ـــــ کبھی ضرور آؤں گا۔ انشاءاللہ"

تم نے رومال کا گیند کھولا اور اسے ہونٹوں پہ رکھ کر بولیں۔ "میں تو سمجھی تھی آپ کبھی نہیں آئیں گے۔"

"چلو بے بی ـــــ چلو میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔ کم آن ڈارلنگ۔"

تم دو قدم پیچھے ہٹ کر بولیں: "آپ مجھے ڈارلنگ نہ کہا کریں۔ ڈیڈی کی طرح۔"

میں نے کار کی چابی میز پر سے اٹھائی اور حکیمانہ لہجے میں بولا: "چلو گھر چلیں۔"

"میں اکیلی چلی جاؤں گی ـــــ میری سہیلی گیٹ پر کھڑی ہے۔ میں اس کے ساتھ جاؤں گی۔"

یکدم مجھے احساس ہوا کہ پہلی بار جھجک مٹ جانے پر شاید تم دوبارہ سہ بارہ اور پھر تواتر سے یہاں آنے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہ کرو۔ یعنی تنہا ہوٹل کے ایک بیچلر روم میں آنا میرے ان سفارتی مراسم کو تباہ کر سکتا تھا جو میرے تمہارے خاندان سے تھے۔ میں تمہیں بدنامی سے اپنے آپ سے اور سب سے زیادہ تمہارے اپنے نوشگفتہ ضمیر کی زد و کوب سے بچانا چاہتا تھا۔

"بے بی اگر تم مجھ سے ایک وعدہ کرو تو پھر میں تمہارے گھر آؤں گا۔"

مجھے علم تھا کہ اس عمر میں وعدے کا بڑا پاس ہوا کرتا ہے۔

"جی؟ ـــــ ضرور ـــــ!"

"تم یہاں کبھی نہیں آؤ گی ـــــ کبھی نہیں۔ سمجھیں۔"

تم نے آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ "کیوں جی!"

"اس لئے کہ ـــــ کہ میں تمہارا یہاں آنا پسند نہیں کرتا۔ اس لئے کہ تمہارے ڈیڈی کو اگر علم ہو گیا تو وہ بھی ناخوش ہوں گے۔"

تم نے لب کاٹا اور نظریں جھکا لیں۔

دیکھو زری۔ ابھی تم بہت چھوٹی ہو۔ ان باتوں کو نہیں سمجھتیں۔ تمہیں میری بات ماننا ہوگی۔"

"جی مانوں گی۔"

"وعدہ ہے ناچیر!"

تم نے اثبات میں سر ہلایا اور اس غیر مشروط وعدے پر تمہارے ہونٹوں نے ایک ہلکی سی ہنسی سے مہر لگا دی۔

اس واقعے کے بعد میں مہینے میں ایک آدھ بار تمہارے گھر جانے لگا لیکن کچھ اس التزام سے کہ تمہیں مجھ سے بات کرنے کا ایک لمحہ نہ ملتا۔ میں تمہارے پہنچنے سے پہلے اقبال کو فون کرتا اور اگر وہ گھر پر موجود نہ ہوتا تو پھر میں ادھر کا قصد بھی نہ کرتا۔ جتنی دیر تک اقبال گھر پر رہتا میں بھی رکا رہتا۔ اگر اسے کہیں جانا ہوتا تو میں بھی فوراً اٹھ جاتا۔ اس احتیاط کی کچھ وجہ تو تمہارا تحفظ تھا اور کچھ اس داخل خارج مقدمے میں مہ رخ کا نزول بھی ہو چکا تھا اس لیے میں تمہارے قرب کا متمنی نہ ہوسکا۔

میرے لیے مہ رخ بڑی منحوس صورت اور مبارک قدم ثابت ہوئی۔ اس سے ملاقات کے وقت مجھے یہ علم نہ ہو سکا کہ وہ اس طرح میری عنان حکومت سنبھال کر میری خوشیوں کے راہوار پر سوار ہو جائے گی۔ مہ رخ کا اصلی نام استل الحفیظ اور قلمی نام مہ رخ تھا۔ وہ ایک مشہور اخبار میں عورتوں کا کالم لکھتی تھی۔ اس کالم کے اوپر روز مہ رخ کی تصویر چھپتی تھی اور اسی تصویر کے باعث میں نے اسے پہچان بھی لیا تھا۔ گو تصویر میں جو خیرگی تھی وہ اس کی اصلی صورت میں موجود نہ تھی۔ پھر بھی مجھ پر اس صورت کا اثر ہونا تھا ہو کر رہا۔

مہ رخ سے میری ملاقات شالیمار میں ہوئی تھی۔ اکابرین شہر چین کے صدر چو این لائی کو ایک نظر قریب سے دیکھنے کیلئے اس جی داری سے ٹوٹ کر آئے تھے کہ کار پارک کرنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ عورتیں پھولوں کی پتیاں پلاسٹک کے لفافوں میں لیے روش کے کنارے کھڑی تھیں۔ اس نسوانی دیوار جیسی میں جگہ بنا کر آگے بڑھنا قریب قریب ناممکن تھا۔ میں بھی انچ انچ آگے کھسکتا بڑھ رہا تھا کہ میری نظر مہ رخ پر پڑی۔ پہلی نظر میں ہی میں نے اس کالم نگار خاتون کو پہچان لیا۔ اس کے ہاتھ میں

ایک لمبی ڈاڑھی اور پنسل تھی ۔ وہ اچک اچک کر بیقراری سے ادھر ادھر چکر لگا رہی تھی ۔ اسی بیقراری کے عالم میں وہ گھستی گھساتی لوگوں میں جگہ بناتی مجھ تک آ پہنچی ۔ اب اس سے نائک چندی ابنیوں کی روش تین فٹ کے فاصلے پر تھی اور وہ آسانی سے صدر لیو شاؤچی کے درشن کر سکتی تھی ۔ میں نے قرونِ وسطیٰ کے جانبازوں کی طرح اس کیلئے جگہ چھوڑتے ہوئے پوچھا :

"محترمہ ! آپ مہ رخ ہیں ناں ؟"

"جی ——"

"آپ خواتین کا صفحہ لکھتی ہیں —— میرا قیاس درست ہے کیا ؟"

دل میں وہ اپنی شہرت پر بہت خوش ہوئی لیکن بظاہر چڑ کر بولی : —— "آپ کیوں پوچھتے ہیں ؟"

"اس لئے کہ اگر واقعی آپ مہ رخ ہیں تو میں آپکی مدد کروں گا ۔ آپ کا کالم بہت دلچسپ ہوتا ہے اور لوگ بڑے زیادہ شوق سے پڑھتے ہیں ۔"

مہ رخ کا نام سن کر چند لڑکیوں نے پلٹ کر دیکھا ۔ آپس میں نوٹس ملانے اور کھسر پھسر کرنے لگیں ۔ میری تعریف کا خاطر خواہ اثر ہوا اور مہ رخ سے ناز کی کیفیت جاتی رہی ۔ وہ ہنس کر بولی ——

"واقعی ——"

یہ ہنسی میرے حق میں بڑی ناانصاف ثابت ہوئی ۔ میں نے ایک ہی وار میں سارے ہتھیار ڈال دیئے اور دل کے قلعے کی تمام چابیاں اسے نذر کر دیں ۔

"ادھر آجایئے میرے سامنے یہاں سے آپ بہتر دیکھ سکیں گی :"

وہ مجھ سے چھ انچ آگے آ کر کھڑی ہو گئی ۔ اب اس کے بالوں کی گندھک آمیز خوشبو اور بغیر آستینوں کی قمیض سے اٹھنے والے جسم کی گرمی مجھ تک بلا روک ٹوک پہنچنے لگی ۔ اس نے کوئی نامعلوم فرانسیسی سینٹ استعمال کر رکھا تھا لیکن اس سینٹ پر لائف بوائے سے دھلے ہوئے جسم کی خوشبو غالب تھی ۔

"دراصل آج میں دفتر والوں کے ساتھ نہیں آئی ورنہ مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی۔ وہ سامنے جو آدمی بیٹھا ہے ناں ___ وہ رنگین چھتریوں تلے ___ پریس گیلری میں۔ وہ ہمارا سب ایڈیٹر ہے لیکن میں اسے بلانا نہیں چاہتی ___ " یہ بات اس نے یک رخی ہو کر کی اور پھر جیسے اپنے آپ سے بولی ___ "اللہ جانے اگر ظفر نہ ملا تو پھر میں واپس گھر کیسے پہنچوں گی۔"

اس کے آخری جملے پر ذہن میں پلان بناتے ہوئے میں نے کہا ___ "میں سیف گارڈ انشورنس کا زونل مینیجر ہوں۔ آصف تنویر ___"

"میرا اصلی نام امتل الحفیظ ہے ___ سلام علیکم ___"

"اگر آپکو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں آپکو گھر پہنچا آؤں گا۔"

میری شوخ چشمی کا جواب اس نے بڑی بے رخی سے دیا۔ "جی نہیں۔ شکر ہے یہاں ضرور کوئی نہ کوئی واقف مل جائے گا۔"

لیکن عجیب اتفاق ہے کہ مسرت رخ کو اس بھرے مجمع میں ایک بھی واقف شخص نہ ملا جو اسے گھر لے جاتا۔ اور بالآخر جب وہ شام کے میری کار میں بیٹھی تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ میرے ساتھ دفتر تک جائے گی اور وہاں سے تھوڑی دیر بعد اکیلی بس پہ گھر چلی جائے گی۔ میں نے کسی قسم کی حجت بازی نہ کی کیونکہ میرے لئے یہ بھی باران رحمت سے کم نہ تھا۔

مسرت رخ بڑی چمکدار گفتگو کرتی تھی۔ ٹکسال سے نکلے ہوئے چمکدار سکوں کی طرح۔ اس گفتگو میں دلآویز مسکراہٹوں اور کھنک دار قہقہوں کی چیپیاں لگا کر وہ نفس مضمون کو بڑا معنی اور دلچسپ بنا دیتی تھی۔ حالانکہ نہ تو اس کی تحریر میں ذہانت تھی اور نہ ہی اس کی کھوپڑی میں فطرت نے معمول سے زیادہ مغز بھرا تھا۔ ایک عام سی سادہ لڑکی جو حسن اتفاق سے کالم لکھنے پہ مامور ہو گئی تھی۔ اس کالم لکھنے نے اس کی شخصیت میں ایک قسم کا وقار پیدا کر دیا تھا جیسے کوئی چھوٹے قد کی عورت ایڑی والی جوتی پہن کر خود اعتمادی محسوس کرتی ہے اسی طرح خواتین کا کالم لکھ کر مسرت رخ مردوں سے بے تکلف بات کرنے میں، گفتگو کا دھارا موڑنے میں، برجستہ جواب کو احمق پن کی دلیل بنانے اور خواتین کی سائیکولوجی

پر سیر حاصل بحث کرنے کے قابل ہو گئی تھی۔ عورتوں کے مسائل کی وکالت کرتے ہوئے اس کی نظروں میں مردوں کی ذات بالکل بے وقعت ہو کر رہ جاتی۔ جب وہ باتیں کرتی تو اس کی باتوں میں قندھاری انار کا کھٹا میٹھا مزہ اور رنگ ہوتا۔ عجیب سی بات ہے کہ سارے دفتر میں اس گفتگو کا کوئی شیدائی نہ تھا اور سب اسے ایک PUSHING لڑکی سمجھتے۔

مہرخ سے ملاقات ہونے کے بعد میں بڑے تواتر سے تمہارے گھر جانے لگا۔ تم کو دیکھ کر اب مجھ پر مراقی کیفیت طاری نہ ہوتی تھی۔ میں تم سے تمہارے جذبے سے خوفزدہ نہ رہا۔ میں نے اپنے جملہ حقوق مہرخ کے نام محفوظ کر کے اپنے آپ کو نظرِ بد سے بچانے کا انتظام کر لیا تھا۔ تمہارے لئے شاید یہی بہت تھا کہ میں نے تمہارے گھر کو یاد تو رکھا۔ کیونکہ نہ تو تم نے مجھے کبھی بلانے کی کوشش کی اور نہ کبھی مجھے اکیلا پا کر میرے پاس ہی آئیں۔ بس مجھے دیکھ کر تم میں اتنی تبدیلی آتی کہ تمہارا چہرہ دیکنے لگتا۔ جیسے سرِ شام برف آلود چوٹیوں پر شفق کی روشنی پڑ رہی ہو۔ کانسی کے گلدان میں سرخ گلابوں کا عکس پڑ رہا ہو۔ جیسے کوئی بچہ ہتھیلی میں ٹارچ جلا کر اپنی انگلیوں کی نارنجی روشنی دیکھنے لگے۔ تمہاری ہسپانوی لیموں جیسی جلد پر اتنی سرخی کا عود کر آنا بذاتِ خود ایک بہت بڑی علامت تھی لیکن میرے لئے یہ علامت اپنا مطلب کھو چکی تھی۔

مہرخ سے شناسائی ملنے کے بعد مجھے محسوس ہوا اتنے برس اتنے قرن میں ایک تیر کی مانند گھومتا رہا ہوں۔ ایک ایسا تیر جس کا ہدف کھو گیا ہو۔ میری ساری زندگی آبشاری تھی۔ شور و غوغا بھرے۔ بہت ساری عورتیں میری زندگی میں سمندر کے جھاگ کی طرح آئیں اور چلی گئیں۔ مجھ سے ان کا رشتہ سطحی تھا۔ ان عورتوں کی محبت میں جانبین کی کوئی ذمہ داری نہ تھی۔ نہ ذہنی نہ جسمانی۔ وہ مجھے اور میں انہیں کھیل کود کے شریک سمجھ کر علیحدہ ہوتے تھے۔ کسی سے بھی بچھڑ کر مجھے پامالی، مکمل خستہ حالی کا دورہ نہ پڑا تھا۔ نہ میں نے کبھی نیند بڑھائی نہ خواب آور گولیاں کھائیں اور نہ کبھی دل بہلانے کے لئے شہر چھوڑا۔ لیکن جونہی مہرخ کار سے اتری مجھے یوں محسوس ہوا کہ اب میں زندہ نہ بچوں گا۔ اس کی دل پہ گندہ ہو گئی تھی۔ اس کی آواز اس کے قہقہے، اس کی لمس دل کو تھامے بیٹھی تھی ورنہ میں تو

شاید اسی روز کچھ کر بیٹھتا۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ دمے کے مریض کی طرح میرا سانس اکھڑ رہا ہے میری ٹانگیں کمزور پڑ چکی ہیں اور میں ـــــــ وہ رہا جو اب تک تھا مجھ میں حضرت علیلے جیسی انکساری ـــــ کچھوے جیسی سخت جانی ـــــ فاختہ جیسی ناعاقبت اندیشی اور نہ جانے کیا کیا خاصیتیں پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔ میں ان چند گھنٹوں میں بہت زیادہ بڑھ گیا تھا یا بہت زیادہ گھٹ گیا تھا۔ کوئی ایسی قوت تھی جو میرے ماضی کو رگڑ سے مٹا رہی تھی جو میرے مستقبل کو تشکیل دیے بغیر جستی حروف میں میرے حال کا نفسِ مضمون تیار کر رہی تھی۔ میں ساری رات جاگتا رہا۔ میں نے کئی درجن سگرٹیں پھونک ڈالیں۔ کئی بار مسہری لگائی۔ اندر لیٹا۔ پھر بڑبڑا کر باہر نکلا۔ مسہری ادھیڑ چڑھائی اور پھرنے لگا۔ کوئی صاحب عمداً ایسا تھا جو اونگھ سے جگاتا اور مہ رخ کے خیالوں میں غلطاں کر دیتا۔

میں بے خواب آنکھیں اور بوجھل مراد اٹھا اٹھا جہرویے دوسرے دن مہ رخ کے دفتر پہنچا۔ وہ ہاتھ میں پنسل اور ڈائری لیے ایک عینک پوش آدمی سے چہرہ ہاتھیں کر رہی تھی۔ اس نے میرا رتی بھر نوٹس نہ لیا۔

"مجھے آپ سے کچھ کام تھا ـــــ"

مہ رخ نے مجھے پہچاننے سے قطعی طور پہ انکار کرتے ہوئے کہا: "فرمائیے۔"

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔"

"جی نہیں۔ میں نے پہچان لیا ہے۔ آپ سیف گارڈ انشورنس کمپنی کے زونل منیجر ہیں۔ تو یہ آصف صاحب ـــــ فرمائیے!"

عینک والے شخص کی باچھیں خواہ مخواہ کھل گئیں اور وہ بڑے اخلاق سے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا ـــــ "ظفر ـــــ میں یہاں فوٹوگرافر ہوں۔"

تو یہ ظفر تھا۔ منحنی سا فوٹوگرافر۔ چھوٹی سی فرانسیسی داڑھی اور انتہائی چست ٹیڈی پتلون میں ملبوس ظفر! ـــــ اس کے چہرے پر کسی قسم کی ظفر مندی کے آثار نہ تھے بلکہ یوں لگتا تھا جیسے وہ عادتاً یا مصلحتاً بھوکا رہنے کا عادی ہو۔

میں نے اس سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" میں نے از راہِ تکلف کہا۔

"بہت جلد آپ نے یہ بات کہہ دی ہے ——" فوٹوگرافر نے انگریزی میں کہا۔ یہ بات مہ رخ کے قہقہہ کا باعث ہوئی۔ میرے منہ پر تالا پڑ گیا۔

مہ رخ دیر تک ہنستی رہی اور وہ نیم مسخرہ، نیم فلاسفر، دبلا پتلا ہاتھ ہلاتا چینی چوبی کھلونوں کی طرح ٹانگیں ہلاتا اندر چلا گیا۔

"فرمائیے ——" کچھ دیر کے بعد مہ رخ نے میری خبر لی۔

میں ذاتی طور پر کسی کو انشورنس کے لئے نہ کہتا تھا۔ یہ کام میرے فرائض میں شامل نہیں، لیکن اس وقت مہ رخ سے اس سے بہتر تقریبِ ملاقات کا بہانہ بھی تو نہ تھا۔ میں نے کاروباری لہجہ میں کہا:

"میں حاضر ہوا تھا کہ آپ سے انشورنس کے لئے کہوں۔ سیف گارڈ انشورنس کمپنی کم سے کم پریمیم پر زیادہ سے زیادہ روپیہ ادا کرتی ہے۔"

مہ رخ کچھ طیش میں آ گئی۔ پہلا ہی وار اوچھا پڑا ——"اسی لئے تو میں انشورنس والوں سے گھبراتی ہوں۔ ذرا سی ملاقات بھی ہو تو فوراً انشور ہونے کو کہیں گے۔"

عجیب سی بات اسی لمحے ہوئی۔ جونہی اسے غصہ آیا میری ہمت عود کر آئی۔ ممکن ہے یہ ان سالوں کی ریاضت اور صبر کا نتیجہ تھا جب میں لوگوں کو انشور کرنے نکلا کرتا تھا —— وہ بھی ٹیلیفون ڈائرکٹری میں سے ایڈریس دیکھ کر۔ اب مجھے حالات کے خاطر خواہ ہونے کا احساس ہونے لگا۔

"ہماری کمپنی عورتوں کی انشورنس نہیں کرتی۔ لیکن میں آپ کو بہت اچھی ٹرمز پر انشورنس دلوا دوں گا۔ پریمیم بھی کم دینا ہوگا اور ——"

"دیکھئے میں انشورنس کروا چکی ہوں —— تھینک یو۔"

اب مجھے حجت بازی میں مزہ آنے لگا۔

"دیکھئے فی زمانہ انسان جتنی بھی انشورنس کروائے کم ہے۔ زندگی کی RISKS بہت

بڑھ چکی ہیں مس مرخ!؟"

"آصف صاحب۔ میں ایک ڈیلی اخبار میں کام کرتی ہوں۔ میرا وقت بہت قیمتی ہے پلیز۔۔۔۔"

"محترمہ مرخ صاحبہ! اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ ایسے قیمتی وقت اور ایسی گرانمایہ شخصیت کے تحفظ کی اشد ضرورت ہے"

جوں جوں اسے غصہ چڑھ رہا تھا میری کمزوری میں کمی واقع ہو رہی تھی۔ میں بھولتا جا رہا تھا کہ میں اچانک اس لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو چکا ہوں۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میرا نام امتل الحفیظ ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس وقت مجھے اسلامیہ کالج جانا ہے ایک مشاعرے پر ——— معاف کیجئے"

یہ جملہ بول کر اس نے بڑے طمطراق سے اپنا بڑا سا بیگ اٹھایا۔ اس میں ڈائری اور پنسل ڈالی اور بیہ تحقاقی دفتر کی عمارت سے باہر نکل گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ میں بھی کسی کتے کی طرح سڑک تک چلا آیا۔ نہ اس وقت مجھے یہ خیال تھا کہ شاید وہ دل ہی دل میں مجھے بے حیا سمجھ رہی ہے نہ ہی اس بات کا خدشہ تھا کہ شاید میرا غلط رویہ ہمیشہ کے لئے اسے مجھ سے بدظن بھی کر سکتا ہے۔ بس ایک لگن تھی ایک کلک تھی۔ اسے زیادہ سے زیادہ وقت تک دیکھنے کی۔ اس کے قریب رہنے کی۔

دفتر کی سیڑھیاں اترتے وقت اس نے چپراسی سے پوچھا ——— "ظفر صاحب کہاں چلے گئے؟"

چپراسی نے پہلے اندر نظر دوڑائی۔ پھر سائیکلوں والے چھپرے کے قریب گیا اور دور سے آتے ہوئے بولا: "جناب۔ وہ ابھی ابھی یونیورسٹی کیمپس گئے ہیں۔"

مرخ تعجب جلاتی ہوئی سڑک پر آ گئی۔ حسن اتفاق سے سڑک سنسان پڑی تھی۔ دو رکشے گزرے دونوں میں سواریاں لدی تھیں۔ مرخ بار بار اپنی گھڑی دیکھ رہی تھی۔

"میری کار حاضر ہے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ ساری راہ ایک بار بھی آپ کو انٹرویو کیلئے تنگ نہیں کروں گا ——— وعدہ ——— !"

اس نے لمحہ بھر کو میری طرف دیکھا اور پھر کار میں بیٹھ گئی۔

مہ رخ فلرٹ لڑکی نہ تھی۔ فقط ذرا بے احتیاط سی باتیں کرنے، اٹپٹے پتے چھوڑنے، شام گھات دکھانے اور بازی لوٹ لے جانے کا اُسے چسکا تھا۔ اس کا جسم اور دل بالکل پاک تھے۔ صرف نیت نیک نہ تھی۔ عام عورتوں کی طرح جو بن سج کر بازار جاتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ نظروں ہی نظروں میں سارے جہان کے مرد ان کے عاشق ہو جائیں لیکن اوچھا آوازہ کوئی نہ کسے۔ ان کے دوپٹے کو بھی کوئی انگلی بھی نہ چھو پائے۔ مہ رخ بھی یہی چاہتی تھی کہ چاہنے والوں کے پشتارے لگ جائیں جو ایکبار اس سے بات کرے ہمیشہ کے لیئے اس کا بلیٹین نکال لے۔ وہ اپنی جودت طبع کی خود اس قدر قائل تھی کہ ہر مرد کو اس میدان میں ہرا کر اسے ذہنی سکون ملتا تھا ____ گو بعد میں مجھے علم ہو گیا کہ یہ ذہانت بھی بالکل سطحی ہے۔ اس میں نہ تو اصلی ذہانت کے ابرق جیسے پرت در پرت تھے نہ گہرے پانیوں کا سکون۔ اور نہ ہی خیال کی گہرائی۔ زیادہ سے زیادہ وہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کی ”ہ“ یا رنوں کی طرح ضلع جگت کی ماہر تھی۔ بہت جلد مجھ پر عیاں ہو گیا کہ آم تو سارے غیر کھاتے ہیں۔ میری طرف تو وہ گٹھلیاں پھینکتی ہے۔ لیکن میں مہ رخ کی محبت میں اس قدر محصور ہو چکا تھا کہ اس طمطراق سے مسخرے سے جلتا تو درکنار الٹا اس کی خوشنودی کا خیال ہر وقت رہتا تھا۔ مجھے یہ گٹھلیاں اس قدر عزیز تھیں کہ میں ان ہی کی تلاش میں مہ رخ کے در پر جاتا اور پہروں ملنگ گداؤں کی طرح بیٹھا رہتا۔

جب کبھی میں تمہارے گھر جاتا تو ان اوٹوں کی چمک میرے ساتھ آتی۔ پھر نہ تو نہ مجھے تمہاری روتی ہوئی آنکھیں نظر آتیں نہ تمہارا گم سم چہرہ دکھائی دیتا نہ تمہاری آواز ہی دیتی خاموشی سنائی پڑتی۔ میں تو ہر وقت خلوت اور جلوت میں مہ رخ سے ہی باتیں کئے جاتا۔ اسی طرح ایک روز میں تمہارے ہاں بے دھیان بیٹھا تھا۔ اقبال نے پہلی مرتبہ میری توجہ تمہاری طرف لوٹائی۔

”شبو تم نے اتنا کھایا تمہارے بی ڈار لنگ۔“ اقبال نے پوچھا۔

تم نے نفی میں سر ہلایا۔

”دودھ؟“

"جی پیا تھا ——" تم آہستہ سے منمنائیں۔

"کہاں پیا تھا زری —— ہاں چکھا ضرور تھا اقبال۔ اللہ جانے اسے کیا ہوتا جاتا ہے نہ کچھ کھاتی ہے نہ کسی سے بولتی ہے۔ دو بوتلیں کاڈ لیور آئل کی پلائیں۔ وٹامن بی اور سی کی گولیاں کھلاتی ہوں۔ ذرا رنگ تو دیکھئے اس کا۔ چھپکلی سی نکلتی آتی ہے —— ہے نا آصف!"

میں نے ہسپانوی لیموں جیسی جلد پر نظر ڈالی اور پرے دیکھنے لگا۔ بڑے دنوں کے بعد میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے اور نیکی کرنے پر اکسانے آ بیٹھا تھا۔

اقبال اپنی بندوق کو گن سے صاف کر رہا تھا۔ اس نے تمہاری ممی کی بات پر کان دھرے بغیر کہا —— "آؤ آصف ذرا باہر چلیں کھیتوں کی طرف۔ شاید کوئی سینڈ گروز مل جائے"۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تمہارا شکاری باپ مجھ سے تمہارے متعلق کچھ کہنا چاہتا تھا۔ جب ہم آبادی سے بہت دور نکل گئے اور فضا سے شہری آوازیں غائب ہو گئیں تو وہ اچانک رک گیا اور گھاس پر بیٹھتے ہوئے بولا: "آصف! مجھے زری کے متعلق بڑا فکر رہتا ہے —— میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں"۔

میں مہ رخ کے متعلق سوچ رہا تھا یکدم میرے گھٹنے کمزور پڑ گئے۔

"ہاں —— ہاں ضرور پوچھو ——"

"نہ تو وہ کچھ کھاتی ہے نہ کسی سے بولتی ہے نہ کسی سہیلی سے ملنے جاتی ہے اور نہ ہی اب کوئی اس کی سہیلی ملنے آتی ہے۔ پہلے تو وہ کرنل افتخار کی بیٹیوں سے بہت فری تھی۔ اب کبھی ان کا نام بھی نہیں لیتی۔ میں بڑا فکر مند ہوں"۔

میں نے تھوک نگل کر کہا۔ "کسی ڈاکٹر کو دکھانا تھا اقبال —— شاید معدہ —— ہو"

"دکھایا تھا۔ کرنل وسیم سے سارا چیک اپ کروایا ہے۔ بلڈ ٹیسٹ لیا ہے۔ چیسٹ کا ایکسرے کروایا ہے —— بظاہر وہ بالکل تندرست ہے"۔ اقبال نے انگریزی میں کہا "تعجب ہے ——" دور کہیں چکی چلنے لگی تھی اور اس کی آواز میں [illegible] برکت تھی۔

شکاری کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ میں نے ہمیشہ اقبال کو کھلنڈرے موڈ میں دیکھا تھا۔ کارتوس سے لے کر چیتے کی آنکھوں تک اس کی باتوں کی اڑان تھی۔ اس کے سامنے شکار سے ہٹ کر اگر کوئی بات کی جاتی تو وہ اونگھنے لگتا۔ آج وہ گھاس پہ بندوق پرے رکھے گھٹنوں کو بازوؤں میں لئے متوحش سا بیٹھا تھا۔ اقبال کا یہ پہلو میرے لئے بالکل اجنبی تھا۔ بڑی دیر کے بعد اس نے انگریزی میں بڑے اکھڑپن سے پوچھا ــــ "تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا اسے کسی سے محبت ہو گئی ہے ــــ اگر مجھے علم ہو جائے کہ اسے کس سے محبت ہے تو میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں ــ میں۔۔۔۔ میں زری کی بڑی عزت کرتا ہوں آصف۔"

میرے لئے اس سوال کا جواب دینا سہل نہ تھا۔ ذرا سا اعتراف بھی مجھے اتنی دور لے جاتا کہ پھر میں لوٹ کر نہ آ سکتا۔ میں نے ساری بات کو معمولی روپ دے کر کہا "ابھی کمال اقبال۔ ابھی تو وہ اپنی استانی سے CALF-LOVE کر رہی ہو گی۔"

اقبال نے مڑ کر میری جانب دیکھا۔ اس کی نظر میں بڑی مجروح سی چمک تھی۔ پھر اس نے بندوق اٹھائی اور گھر کی طرف لوٹنے لگا۔ سارا راستہ اس نے جنگلی مرغابی، تیتر، بٹیر، مچھلی کے گوشت کی جداگانہ خاصیتوں پر بحث کی۔ شکار کے گوشت کو کوئلوں پر سینک کر پکانے اور گلانے کے طریقے بتائے لیکن ایک بار بھی پھر اس نے تمہارا نام نہ لیا۔ لیکن اتنی ساری باتوں کے باوجود آج کی تشویش مجھ سے چھپی نہ تھی۔ وہ اپنی اکلوتی بچی کیلئے بڑے بحران میں تھا۔ اس کی باتوں میں آج انہماک تو ضرور تھا لیکن وہ گہری دلچسپی نہ تھی جو عموماً اس کی باتوں سے مترشح ہوا کرتی تھی۔ میں اقبال کی مدد کرنا چاہتا تھا اور کسی قسم کی مثبت گفتگو ہم میں ممکن نہ تھی۔ پورچ کے پاس پہنچ کر میں نے اس سے اجازت چاہی۔ اس نے مجھے روکنا چاہا لیکن میں دل ہی دل میں جو فیصلہ کر چکا تھا مجھے اس پر عمل کرنا تھا اور وہ بھی بہت جلدی۔

میں بڑی عجلت میں رخصت ہوا اور سیدھا ماہ رخ کے پاس پہنچا۔ وہ ایک فل سکیپ پیپر پر بال پن کے ساتھ کچھ لکھ رہی تھی۔ دفتری میز پہ بہت سی تصویریں پڑی تھیں اور ہر تصویر کے اوپر ایک چٹ لگی تھی۔ میں سلام کر کے اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے بڑے صاحب کی طرح سر کے اشارے سے

سلام کا جواب دیا اور کام میں مصروف رہی۔ میں نے جھک کر صفحے پر دیکھا۔ لکھا تھا:

"میرے میاں شادی کی سالگرہ بھول گئے۔۔۔"

اس عنوان کو نیک شگون سمجھ کر میں نے کاغذ پر ہاتھ رکھا اور آہستہ سے بولا:

"امتل الحفیظ ——"

اس نے نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا —— "امتل الحفیظ بہت ذاتی نام ہے —— مہ رخ کہئے ——"

گرم استری پر جیسے پانی کے چھینٹے پڑ گئے۔

"مہ رخ!"

وہ کاپی پر لکھتے ہوئے بولی —— "آٹھ نیک شگون ضرور ہیں لیکن چہرے کا میک اپ خراب کر دیتے ہیں۔ شادی کی پہلی رات ۔۔۔۔"

"مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنا ہے۔"

"وہ اپنے بچوں کی دیکھ بھال خود کرتی ہیں —— بیگم رضوانی سے ایک ملاقات۔"

"میری بات سنو مہ رخ —— خدا کے لئے ——"

"ٹین کے ڈبوں سے آراستہ کھانا —" وہ تصویروں پر کیپشن لکھتی گئی۔

"مہ رخ ملیر کے لئے میری طرف توجہ دو۔"

وہ قلم گھیستے ہوئے بولی —— "فرج دیا۔ اپنے شوہر کی چہیتی بیگم"۔

"اللہ کے لئے مہ رخ مجھے تم سے محبت ہے۔"

"ملکہ از بیتھ دس لاکھ کی مالیت کے ملبوسات لے کر سفر کرتی ہیں۔"

میں نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام کر کہا —— "مجھے تم سے محبت ہے مہ رخ۔"

"محبت کی شادی میں ناکامی کی وجہ ——"

اب میں جھنجھلا کر اٹھا اور اس کے ہاتھوں سے کاغذ چھین کر بولا —— "مہ رخ۔ مذاق کی ایک

حد ہوتی ہے۔"

"مذاق کون کر رہا ہے؟"

میں نے چڑ کر کہا: "اور میرے ہر سوال کا وہی جواب ہے جو آپ نے دیا۔"

ماہ رخ نے کاغذ بڑی اتراہٹ سے میرے ہاتھوں سے چھینا اور اوپر اٹھا کر بولی۔۔۔

"جناب۔ میں کچھ عنوان بنا رہی تھی اپنے کالموں کے لئے ــــ دیکھئے پسند فرمایئے۔"

"اچھا۔ آج تم سنجیدہ نہیں ہو۔ میں پھر آؤں گا۔"

جب میں دروازے کے پاس پہنچ گیا تو ماہ رخ اپنی میز پر بیٹھتے ہوئے بولی: "اور وہ کلاسیکی موسیقی کی کنسرٹ پر نہیں جائیں گے۔ ابھی کل تک تو بڑا جوش تھا۔"

ماہ رخ سے ناراض ہونا اور پھر اس ناراضگی کو مستقل کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ میری شخصی آزادی اس کے حضور بالکل ختم ہو چکی تھی ــــ میں دم دبائے کتے کی طرح دوبارہ کرسی پر آ بیٹھا۔ اس کے بعد کسی قسم کی گفتگو نہ ہوئی۔ میں اپنا جھوٹا وقار قائم رکھنا چاہتا تھا اور وہ نیم جیبوں کو دھوئیں میں اڑاتی تھی۔ اس لئے جب تک وہ لکھتی رہی میں تصویریں دیکھتا رہا۔ میں نے ان تصویروں کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ پاکستان کی خواتین فینسی ڈریس کو بہت پسند کرتی ہیں۔ جا بجا کلچرل شوز میں عورتیں گھیرے لپٹے سے لیس، غرارے، سندھی قمیص، چوڑی دار پاجامے، پشواز، سمٹ کے انداز کی ساڑھی، وہ گز سے لہنگے، پٹھانی کرتے اور شیشوں کی بنی ہوئی ٹوپیاں پہنے ہوئے تھیں۔ پنجابی لڑکیوں کو پٹھانی بننے کا شوق تھا۔ سندھی لڑکیاں ساڑھی پہنے اترا رہی تھیں۔ معمر عورتیں چوڑی دار پاجاموں اور عربی لباسوں میں ملبوس تھیں۔ غرضیکہ بڑے پیمانے پر ایک بڑا [illegible] کھیلا تھا۔ فیشن کے ان مقبول شوز کے علاوہ ان خواتین کی تصویروں کا بھی پلندہ دھرا تھا جو ایکٹریس بنتے بنتے کسی طرح بچ گئی تھیں۔ یکسر کا پورا چہرہ اور تین چوتھائی چہرے کی ان گنت تصویریں تھیں۔ سب شکلوں پر وہی ایک لیمن ڈراپ قسم کی مسکراہٹ تھی۔ کچھ تصویریں ان پارٹیوں کی تھیں جو شادی سالگرہ اور نوجوان لڑکوں کے یورپ جانے کی تقریبوں پر دی جاتی ہیں۔ ان تصویروں میں مہمان عموماً

دولہا دلہن، سالگرہ منانے والا یا سفر پہ جانے والا نہیں ہوتا بلکہ وہ افسرِ بالا یا مشہور آدمی ہوتا ہے جن کے ارد گرد تمام مہمان گھسنے کی کوشش کریں۔ میں نے تو ایک آدھ تصویر میں یہاں تک ظلم دیکھا کہ دولہا اور دلہن کے عین درمیان ایک گنجے سر والے صاحب براجمان ہیں۔ ارد گرد گھر والوں کی دو رویہ پلٹن کھڑی ہے۔ نیچے رقم ہے:

"دولہا دلہن کے درمیان جناب اعزاز الحق صاحب"

ان تصویروں پر مستزاد ان معمر لیڈر نما عورتوں کی تصویروں کا اجتماع تھا جو بیرونی ممالک کے سربراہوں کا خیر مقدم کرنے ایئر پورٹ کے وی آئی پی ENCLOSURE میں پہنچی تھیں۔ جنہیں مقامی فنکشنز پر پہلی قطار میں بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ جو زنانہ جلسوں میں صدارت کے فرائض ادا کر چکی تھیں ان خواتین کے چہرے فوٹو گرافروں کی باقاعدگی کے باوجود بیل مچھلی کی طرح شل شل اور بے جان نظر آ رہے تھے۔ میں یہ تصویریں دیکھنے میں مصروف تھا کہ ماہ رخ اٹھتے ہوئے بولی:

"کیوں چلئے گا کہ ناراض رہئے گا ابھی۔"

ابھی ہم مال تک پہنچے تھے کہ مجھ پر پھر دورہ پڑا۔

"ماہ رخ! یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟"

"کون سا سلسلہ! دیکھئے دیکھئے آہستہ چلیے رکشا آ رہا ہے ادھر سے۔"

"میری گرویدگی اور تمہاری بے رخی۔"

"جب تک آپ چلانا چاہیں۔ ساری کاروائی یک طرفہ ہے۔"

میں نے سڑک کی رفتار پہ موڑ کاٹا۔

"اللہ۔ آج آپ صحیح سالم لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔"

"ماہ رخ! میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں جو شادی کے بعد عورتوں کی آزادی سلب کر لیا کرتے ہیں۔ تم چاہے ساری عمر عورتوں کا کالم لکھنا خدا قسم مجھے اعتراض نہ ہوگا۔"

"یہ تو میری مرضی پر منحصر ہے شاید میں جرنلزم فوراً چھوڑ دوں۔"

ایک تانگے سے ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔

"ہم دونوں کی مرضی ہمیشہ ایک ہوگی ماہ رخ — ہمیشہ!"

وہ کھلکھلا کر ہنس دی — "یعنی بالا ہی بالا میرے حقوق آپ کے نام محفوظ بھی ہوگئے۔"

"تمنا تو میری یہی ہے۔"

"خوب — اللہ کے لئے اتنی تیز نہ چلایئے گاڑی!"

مجھ پر اپنی محبت کا بوجھ بڑا شدید ہو چلا تھا اور گاڑی بے قابو ہو کر کبھی دائیں کبھی بائیں مڑنے اور جھولنے لگی تھی۔

"آصف صاحب۔ کیوں مفت میں بدنام کرنے لگے ہیں مجھے۔ صبح اخبار میں چھپے گا — — ماہ رخ، خواتین کی کالم نگار — سیتلا مندر کے پاس حادثے کا شکار ہوگئیں — ان کے ساتھ کار میں جو شخص تھا اس کی شناخت جاری ہے۔"

میں نے گڑ گڑا کر کہا: "تم دن بھر میں کسی وقت سنجیدہ بھی ہوتی ہو کہ نہیں۔"

اس نے بیکلسا منہ بنا کر جواب دیا: "میرا خیال ہے سارے دن میں مجھے غیر سنجیدہ ہونے کا ایک لمحہ بھی میسر نہیں آتا۔"

"خدا کے لئے ماہ رخ مجھ سے شادی کر لو پلیز۔"

"اب اگر آپ نے مجھ سے ایسا مذاق کیا تو میں یہیں اتر جاؤں گی۔ اسی لمحہ!"

میں خاموش ہو گیا اور کنسرٹ کے اختتام تک خاموش رہا۔

لان پر رنگدار نواڑی کرسیاں بچھی تھیں اور کنسرٹ شروع ہونے میں ابھی تھوڑی دیر تھی۔ ہمیں ایسی جگہ ملی جہاں سے ہر آنے جانے والا آدھ فٹ کے فاصلے سے گزرتا تھا۔ شامیانے تلے اکابرین شہر کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ مجمع میں عورتوں کی اکثریت تھی اور ان میں وہ خواتین زیادہ تھیں جو شوہروں کے شانہ بشانہ بڑے ٹھسے سے آئی تھیں۔ عورتوں کی تعداد کچھ اس لئے زیادہ نہ تھی کہ یکدم لاہور کی مستورات کن رس ہو گئی تھیں اور انہیں موسیقی سے عشق ہو گیا تھا بلکہ اکثر اس لئے آئی تھیں کہ ان کے پاس کچھ ایسے

لباس تھے جو لوگوں کو دکھانا بہت ضروری تھا۔ کچھ اس لیے تشریف لائی تھیں کہ صبح ہی انہیں اپنی ہمسائی اور دوستوں کو بتانا تھا کہ رات وہ بھی کنسرٹ پر موجود تھیں۔ کچھ محض اس لئے چلی آئی تھیں کہ آج شام کنسرٹ سے بہتر شہر میں کوئی اور پروگرام نہ تھا۔ . . . بیگمات کی خیرہ کن زیبائش ایسی تھی کہ بڑی بڑی رنگ برنگی طوائفیں کان پکڑتیں اور ان سے لباس پہننے کا سبق حاصل کرتیں۔ مجھ سے ایک مرتبہ ایک ٹیکسی گرل نے شکایتاً کہا تھا:

"جناب جب سے بیگمات طوائف گیری کرنے لگی ہیں انہوں نے ہمارے رزق پر لات مار دی ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے سوال کیا۔

"پہلے مرد طوائفوں کے پاس اس لئے زیادہ آتے تھے کہ گھریلو بیبیاں سادہ لباس پہنتی تھیں۔ اور اپنے آپ کو ڈھانپے رہتی تھیں۔ اب تو بیگمات ہر پہلو سے اپنے آپ کو یوں پیش کرتی ہیں کہ طوائف دنگ رہ جاتی ہے۔ اب ہم لوگوں کو کون پوچھے بھلا!"

آج چونکہ میں بظاہر مہ رخ سے ناخوش بیٹھا تھا اس نے میری نظروں میں تنقید زیادہ تھی اور تحسین کم۔ سجی سجائی عورتوں کو دیکھ کر مجھے سامرسٹ کا روسٹ یاد آنے لگا۔ ایسا روسٹ جو بڑے سلیقے سے سٹین لیس ٹرے میں پیش کیا ہو۔ ان عورتوں کا ہر رنگ آپ کے سامنے تھا۔ آپ کے تخیل کیلئے کچھ باقی نہ تھا۔ یہ مردکی تواضع تھی۔ سوءِ ہضم پیدا کرنے کی حد تک تواضع۔

کنسرٹ ختم ہونے کے بعد ہم دونوں مہ رخ کے گھر چل دیئے۔ ساری راہ نہ میں نے اسے بلایا اور نہ ہی اس نے مجھ سے کوئی بات کی لیکن جونہی وہ میکلوڈ روڈ کے پہلو میں ایک بلڈنگ کے پاس اتری میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا:

"مہ رخ!"

مہ رخ نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا اور تنک کر بولی: "مسٹر آصف! میرا خیال تھا کہ مرد اور عورت میں افلاطونی محبت ممکن ہے لیکن یہ تجربہ غلط نکلا۔ مرد اور عورت میں کیسا ہی لاتعلق رشتہ ہو ان دونوں میں سے ایک کو ضرور توقع پیدا ہوتی ہے محبت کی۔ خدا حافظ۔"

"مہ رخ۔ سنو تو!"

"کیا سنوں۔ خدا جانتا ہے کہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس نے آپکو غلط امید دلائی ہو۔ پھر بھی غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ ہو گئی۔ ہو گئی ناں!"

"مہ رخ۔ تم لوٹ کر مجھ تک ضرور آؤ گی۔"

"فی الحال تو میں ظفر کی طرف مراجعت کر رہی ہوں۔ خدا حافظ۔ مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کیجئے گا۔ یہ بات طے ہے۔"

مہ رخ جلدی سے روانہ ہو گئی اور میں کتنی ہی دیر وہاں کھڑا رہا۔ ظفر۔ مہ رخ۔ چوب خشک جیسی ٹانگیں چلانے والا نیم مسخرہ۔ نیم فلاسفر۔ اس آتشبازی کا منظور نظر ہے یہ حقیقت مجھے سمجھ نہ آتی تھی ـــــ بڑی دیر بعد جب میں کار میں بیٹھا تو ونڈ سکرین پہ مجھے تمہاری صورت نظر آئی۔ ہسپانوی لیموں جیسی جلد، گم سم آنکھیں، سینے پر لٹکتے ہوئے لچکیلے سانپ اور سانپوں کے منہ میں گڑھل کے آتشیں پھول۔ میں نے تم سے ایسی کوئی بات نہ کی تھی جس سے محبت کی بُو آتی ہو۔ پھر تم نے آپی آپ یہ فیصلہ کیوں کر لیا۔ میری محبت کے بغیر تمہارا وجود نامکمل ہے۔ شاید مہ رخ ٹھیک ہی کہتی تھی۔ مرد اور عورت کا رشتہ کبھی لاتعلق نہیں ہو سکتا۔ یہاں ہمیشہ ایک وائرس موجود رہتا ہے جو مکمل بھولپن اور سادگی کو ختم کر دیتا ہے۔ یہ وہ بتیاں ہیں جو آپی آپ نیلے پانیوں میں منعکس ہو جاتی ہیں۔

دوسرے دن سہ پہر کے وقت میں تمہارے ہاں پہنچا۔ یہ میری خود غرضی تھی کہ میں تمہاری عقیدت کے چابک سے اپنی زخمی انا کو سینک دینا چاہتا تھا۔ میں ہمدردی وصول کرنے اس جگہ پہنچا جہاں کا ہر ذرہ محبت کے وائرس میں ڈوبا ہوا تھا۔ جب میں نے کار کو پورچ میں روکا تو پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ شاید تمہارے ممی ڈیڈی گھر پر نہ ہوں لیکن بھاگ جانے کی راہ مسدود ہو چکی تھی کار کا شور سنتے ہی تم برآمدے میں آ پہنچی تھیں۔ تمہارا چہرہ زرد تھا۔ کبھی یہ آئرن ٹانک اور غازے کی سرخی سے بے نیازانہ شگفتہ نظر آیا کرتا تھا۔ مجھے دیکھ کر تمہارے کان کی لَوئیں سرخ ہو گئیں۔ تم بھاگ کر ڈرائیور والی سیٹ کی جانب آ گئیں اور ہینڈل گھماتے ہوئے بولیں: "آئیے!"

"ڈیڈی کہاں ہیں تمہارے؟"

"وہ بھی ہرن منا رہے گئے ہیں۔"

"اور ممی جان"

"وہ بھی ساتھ گئی ہیں جی۔"

"تم نہیں گئیں ان کے ساتھ؟" میں نے سوال کیا۔

"میرے سینئر کیمبرج کے امتحان ہیں جی ۔۔۔۔ پرسوں سے۔"

میں نے بالکل انکلوں جیسی آواز میں کہا: "ٹھیک ٹھیک پھر تم تو پڑھو بی بی۔ میں تو چلتا ہوں

اقبال کو بتا دینا میں آیا تھا۔"

تم نے پہلی بار جرأت سے دروازہ کھول کر بات کی! "جی ممی ڈیڈی آنے والے ہیں بس

آپ ذرا تو اندر آیئے۔"

تمہاری آواز میں جو التجا تھی میں نے اس کے سامنے اپنے آپ کو نہتا محسوس کیا۔

"نہیں بچی۔ تمہاری پڑھائی میں حرج ہوگا۔"

"پانچ منٹ رک جائیے بس ڈیڈی آنے والے ہیں ابھی۔"

تمہاری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ان آنسوؤں کا دکھ میں نے پہلی بار محسوس کیا۔ اپنی محرومی کے احساس سے میرا اپنا حلق نمکین ہو گیا۔

تم مجھے ڈرائنگ روم میں لے گئیں۔ میں اسی مخصوص صوفے میں بیٹھ گیا جو آتشدان کے قریب تھا سارے کمرے میں کمائے ہوئے چمڑے کی مہک تھی۔ چیتے کے سر بارہ سنگھوں کی آنکھیں اور شیر ببر کی کھال یکدم بہت جاندار ہو گئی تھی۔ مجھے جنگل کا سناٹا کمرے میں مقید محسوس ہو رہا تھا۔

"پہلا پرچہ کس کا ہے؟"

"انگلش کا۔"

"پھر؟"

"دوسرے دن سنڈے ہے جی!"

"اچھا بھئی میں تو چلتا ہوں۔ تمہارے ڈیڈی تو مچھلی کا شکار کھیلنے گئے ہوں گے۔"

یکدم میں اٹھ کھڑا ہوا اور چلنے کی نیت سے دو ہی قدم اٹھائے ہوں گے کہ تمہاری آواز آئی یہ آواز ایک بچے کی تھی لیکن اس میں میرا بانی کا سارا غم تھا۔ اس پر آنسو ان کا اور تعاون بھی کر رہے تھے۔

"مجھ سے شادی کر لیجئے۔ دو دن کیلئے۔ ایک دن کیلئے۔ ساری لڑکیاں مجھے چھیڑتی ہیں آصف صاحب۔ خدا کیلئے مجھ سے نکاح کر لیجئے۔ ایک گھنٹہ بھر کے لئے چاہے پھر آپ مجھے طلاق دے دیجئے گا۔ میں ہمیشہ آپکی احسانمند رہوں گی"

میرے سر کے عین اوپر بم کا گولہ پھٹا۔

"لڑکیوں کو اس بات کا علم کیسے ہوا زری؟"

"ہو گیا ہے جی۔ ہونا ہی تھا۔ میں آپکی تصویر جو ساتھ لے جاتی تھی بستے میں!"

میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ میری تصویر اس کے پاس کہاں سے آئی لیکن جب میں نے نوٹ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ مجھے بے حد چھوٹی، دل برداشتہ نظر آئی۔ بالکل جنگی قیدی کی طرح مجبور اور بدحال۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھے اور آہستہ آہستہ بولا:

"سنو زری! میں تمہاری محبت کی عزت کرتا ہوں لیکن ابھی تم بچہ ہو۔ یہ دور گزر جائے گا۔ تم خود اس جذبے پر ہنسو گی۔ بچپن میں سبھی اس طرح محبت کرتے ہیں لیکن اقبال میرا جگری دوست ہے۔ ہم دونوں چاہے برسوں نہ ملیں ہماری دوستی بہت گہری ہے۔ میں ایک خاص اعتماد پر یہاں آتا ہوں:"

تمہاری آنکھیں بند تھیں اور پلکوں سے گہری برسات ٹوٹ رہی تھی۔

"اور ایک اور بات بھی ہے زری!"

تم نے آنکھیں کھول دیں۔ آنسوؤں سے لبالب بھری آنکھیں۔

"مجھے کسی اور سے محبت ہے۔ بالکل ایسی ہی محبت جیسی تمہیں مجھ سے ہے۔ میں اس کے بغیر زندہ

نہیں رہ سکتا۔ سمجھیں زری!"

"جی! ـــــ"

نہ جانے وہ سارے آنسو کیسے یکدم خشک ہو گئے۔

میں بھاری قدم اٹھاتا باہر آیا اور کار میں بیٹھا اور پورچ سے رخصت ہو گیا۔ کاش ایسی بات کہ ایک بار تمہیں دیکھ ہی لیتا۔

رات کو پونے دو بجے مجھے اقبال کا فون ملا۔ جب میں ہسپتال پہنچا تو اقبال باہر ٹہل رہا تھا۔

"بڑی دیر لگا دی تم نے آصف۔"

مجھے معلوم نہ تھا کہ اقبال میرے متعلق کس قدر جانتا ہے۔ میں خاموش رہا۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ اس قدر جلد مرنا چاہتی ہے تو میں اسے خود شوٹ کرتا۔ اسے دو گھنٹے مرنے میں نہ لگتے۔"

"آئی ایم سوری اقبال"۔

"ابھی تک میرا خیال تھا کہ زری اتنی سخت دل نہیں ہو سکتی۔ اس کے دل میں میری محبت ضرور ہو گی۔ لیکن ـــــ" میں بلا مقصد اس کا کندھا تھپ تھپانے لگا۔

"ایک شکاری کی بیٹی کا نشانہ اتنا خراب۔ پورے دو گھنٹے سسکتی رہی۔ بہت دیر کر دی تم نے آصف۔"

"کاش میں اسے ہسپتال نہ لایا ہوتا۔ آصف! گھر اور ہسپتال میں خدا تو وہی رہتا ہے نا!"

میں خاموشی کے ساتھ اس کے برابر ٹہلنے لگا۔

"وین ابھی تک نہیں آئی!"

"وین؟ ـــــ" میں نے بے دھیانی سے سوال کیا۔

"زری کو گھر لے جائیں گے۔ اسے نہلائیں گے۔ دھلائیں گے۔ میں اس کے ماتھے کا زخم خود صاف کروں گا۔ بڑی DARLING رہا کی تھی۔ تھی نا آصف!"

میرے پاس اس کی باتوں کا کوئی جواب نہ تھا۔

"میں اصل وجہ سمجھ نہ سکا۔ میں ہرن مینار سے سے لوٹا تو وہ بے ہوش پڑی تھی۔ خانساماں بدبخت گھر پر نہیں تھا۔ وی ایڈیٹ۔"

"پلیز ذرا بنچ پر بیٹھ جائیں۔"

اس نے میری نصیحت پر عمل نہ کیا: "زری مجھے ہمیشہ شکار سے منع کیا کرتی تھی۔ کہا کرتی تھی ڈیڈی اللہ میاں سزا دیتا ہے۔ یہ گناہ ہے۔"

اس کی آنکھوں میں تھوڑا تھوڑا پاگل پن اتر آیا تھا۔

"آصف! کیا اسے کسی سے محبت تھی۔ تم ہمارے گھر آتے تھے تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا کوئی ایسا بھی اس صفحۂ ہستی پر تھا جو زری کو نہ چاہ سکا۔ ہم کبھی اس کے خلاف نہ ہوتے۔ زری نے یہ کیوں سمجھا کر میں اس کی محبت پر معترض ہوتا۔ کیوں؟ کیوں ڈیئر؟"

میں تمہارے ڈیڈی کو کیا سمجھاتا کہ دل کے پانیوں میں منعکس ہونے والی بتیوں کا کوئی قصور نہیں۔ میں تمہارے ڈیڈی کو کیا بتاتا محبت تو امر بیل کی مانند ہے۔ جس درخت پر اس کی زرد زرد ڈالیاں چڑھ جاتی ہیں وہ درخت آپ ہی آپ مر جاتا ہے۔ میں تمہارے باپ کو کیا سمجھاتا اور وہ کیوں کر سمجھتا۔

میں تو تمہیں بھی نہ بتا سکا زری کہ تمہارے جانے کے بعد ماہ رخ کی محبت چھن جانے کے بعد مجھ پر کیا گزری۔ تمہاری محبت مجھ تک ماہ رخ کے توسط سے پہنچی ہے زری۔ اس محبت کا تمہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکا لیکن میں نے تمہارا قرض لوٹا دیا ہے۔ میرے اردگرد امر بیل چڑھ چکی ہے۔ اس میں ہائی سنتھ کے پھول کھلے ہیں۔ پشیمانی کے ارغوانی پھول۔ تاسف کے آسمانی پھول۔ میں تمہارا قرض لوٹا رہا ہوں۔ ہولے ہولے۔ آنسو بہ آنسو۔ آہ در آہ!

تمہاری محبت کی بتیاں میرے دل کے ناسپاس پانیوں میں منعکس ہو چکی ہیں زری۔ لیکن میں بتیاں تمہیں نہیں دکھا سکتا۔ میرا کوئی مستقبل نہیں۔ میرا کوئی ماضی نہیں۔ میں وہ مریض ہوں جس کی شریانوں میں کلوروفارم کا نشہ شامل کر رہا ہے اور وہ آپریشن تھیٹر سے بھاگ آیا ہے۔

بارش بہت زور سے آئی ہے۔ بادلوں کے نف پردے میں شگاف آگئے ہیں۔ مٹی کے گرم وجود سے ٹھنڈی بوندوں نے لپٹ کر سوندھی خوشبو اٹھائی ہے۔ تمہاری یاد کا گھٹا ٹوپ اندھیرا میرے چاروں طرف چھانے لگا ہے۔ میں اس طفلِ زادے کی طرح تھا جو محبت کے نذرانے کو ٹھوکریں مار مار کر بے وقعت کر دیتے ہیں۔ لیکن اب نہیں۔ اب نہیں زری!

لیکن اب کیا فائدہ ؟

اب کیا فائدہ زری؟؟

